اِنسانیت کا امتیاز

مؤلف

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ
۱۳۱۵-۱۴۰۳ھ
۱۸۹۷-۱۹۸۳ء

مکتبۃ البشریٰ
شعبہ نشر واشاعت
چودھری محمد علی چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی پاکستان

اِنسانیت کا امتیاز

مؤلف

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ

۱۳۱۵-۱۴۰۳ھ

۱۸۹۷-۱۹۸۳ء

مکتبۃ البشریٰ

شعبہ نشرواشاعت

چودھری محمد علی چیریٹیبل ٹرسٹ رجسٹرڈ کراچی پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرات اہل علم، عزیز طلبہ اور معزز قارئین کی خدمت میں گذارش:

الحمدللہ! اس کتاب کی تصحیح کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر آئے یا کوئی مفید تجویز ہوتو براہ کرم تحریر کرکے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت بہتر اور غلطی سے پاک ہوسکے۔

جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً
مکتبۃ البشریٰ

برائے خط وکتابت: 9-A/1 محمد علی سوسائٹی، بالمقابل عوامی مرکز، شاہراہ فیصل، کراچی۔75350

کتاب کا نام : اِنسانیت کا امتیاز

مؤلف : حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ

قیمت برائے قارئین: فہرست کتب ملاحظہ فرمائیں۔

سن اشاعت : ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء

ناشر : مکتبۃ البشریٰ چودھری محمد علی چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی پاکستان

Z-3، اوورسیز بنگلوز، گلستان جوہر، کراچی۔ پاکستان

فون نمبر : +92-21-34541739, +92-21-37740738

ویب سائٹ : www.maktaba-tul-bushra.com.pk
www.ibnabbasaisha.edu.pk

ای میل : al-bushra@cyber.net.pk

ملنے کا پتہ : مکتبۃ البشریٰ، کراچی۔ پاکستان

موبائل نمبر : 0321-2196170, 0334-2212230, 0346-2190910
0314-2676577, 0302-2534504

اس کے علاوہ تمام مشہور کتب خانوں میں بھی دستیاب ہے۔

فہرست

انسانیت کا امتیاز

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

انسانیت کا امتیاز

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ ۗ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝﴾ صدق اللّٰہ مولانا العظیم.

مقدمہ وتمہید: قبل اس کے کہ میں اس آیت کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کروں، ایک مختصر بات جو بطورِ مقدّمہ وتمہید ہوگی بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے آیت کے مقصد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے مالک نے یہ کائنات بنائی تو اسے طرح طرح سے سجایا اور آراستہ بھی کیا اور اس میں طرح طرح کی ضرورتیں بھی مہیّا فرمائیں، زمین کا فرش بچھایا اور اطلاع فرمائی کہ

﴿الۡاَرۡضَ فِرَاشًا﴾[1] اور زمین کو فرش بنایا۔

اور فرش پر آسمان کا خیمہ تانا اور اُسے ایک محفوظ چھت بنادیا۔

چناں چہ بتلایا کہ

﴿وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۚ﴾[2] اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا۔

اس چھت میں روشنی کے قندیل لٹکائے، تاکہ اس مکان کی فضائیں روشن رہیں، اور فرمایا:

[1] البقرة:٢٢ [2] الأنبياء: ٣٢

﴿تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا○﴾[1]

برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بُرج رکھے اوران میں روشن چراغ (سورج) اور روشنی بخش چاند رکھا۔

پھران ستاروں کوچھت کے لیے سامانِ زینت بھی کر دکھایا، اوراطلاع دی کہ

﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِ الْكَوَاكِبِ○﴾[2]

ہم نے آراستہ کیا آسمانِ دنیا کو زینت سے، جو ستارے ہیں۔

پھراس فرشِ خاک کو بستر بنا کرایک وسیع ترین دسترخوان بھی بنایا، جس سے ہرقسم کے غلّے، ترکاریاں، پھل، غذائیں اور دوائیں اُگائیں، جس سے ہرقسم کے میٹھے، کھٹّے، نمکین اور دوسرے ذائقوں کے پھل اوردانے نکلتے چلے آتے ہیں۔اور مطلع فرمایا کہ

﴿وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ﴾[3]

اور وہ ایسا ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی برسایا، پھرہم نے اس کے ذریعہ سے ہرقسم کے نباتات کونکالا، پھرہم نے اس سے سبز شاخ نکالی کہ اس سے ہم اُوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گچھے میں سے خوشے ہیں جو (مارے بوجھ کے) نیچے کو لٹکے جاتے ہیں اور (اسی پانی سے ہم نے) انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے، جو کہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

ان سبزیوں کو غایاں کرنے اورحیات بخشنے کے لیے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں رکھیں اورفرمایا کہ

﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ﴾[4]

اورہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں۔

پھر زمین کوفرش اور خوانِ نعمت بنانے کے ساتھ راہ دار بھی بنایا، جس میں جگہ جگہ چلنے

[1] الفرقان: ٦١ [2] الصافات: ٦ [3] الأنعام: ٩٩ [4] الحجر: ٢٢

پھرنے کے راستے رکھے اور فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًاO لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًاO﴾[1]

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو مثل فرش کے بنایا، تا کہ تم اس کے کھلے رستوں میں چلو۔

کائنات کا مقصدِ تخلیق: غرض یہ کائنات ایک عظیم تر بلڈنگ اور رفیع الشان قصر کی حیثیت سے تیار فرمائی، جس میں کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم فرمائے۔ اس کائنات کی یہ ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز پکار پکار کر زبانِ حال سے بتلا رہا ہے کہ ضروریاتِ زندگی سے یہ لبریز مکان کس ضرورت مند مکین کے لیے بنایا گیا ہے، خود مقصود نہیں ہے، یعنی اس میں کسی کو بسانا مقصود ہے، محض مکان بنانا مقصود نہیں اور بلاشبہ کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو اِن سامانوں کا حاجت مند بھی ہو، اور اُس میں ان سامانوں کے استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہو، تا کہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس مکان کی آبادی اور زینت ہو۔ کیوں کہ مکان مکین کے بغیر ویرانہ، وحشت کدہ اور بے رونق ہوتا ہے۔ سو اس عالم میں ارادی کاروبار اور اختیاری تصرّفات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں بسنے والی ذی شعور اور حساس مخلوق جو اس کائنات کو استعمال کر سکتی ہیں، چار ہی قسم کی ہیں۔

ذی شعور مخلوقات: ایک حیوانات ہیں، جن میں سینکڑوں انواع گھوڑا، گدھا، بیل، بکری، طوطا، مینا، شیر، بھیڑیا، سانپ، بچھّو، چرند، پرند اور درند وغیرہ ہیں۔ دوسرے جنّات ہیں، جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر آثار سے سمجھ میں آتے ہیں، اور بلحاظِ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسرے ملائکہ ہیں، جو نوری ہونے کے سبب لطیف اور نادیدہ ہیں، مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں۔ اور نر مادہ ہونے اور نسل کشی سے بَری ہیں۔ اور چوتھے بنی نوع انسان ہیں، جو زمین کے ہر خطہ میں بسے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ یہی چار مخلوقات ہیں جو اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اندر احساس و شعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی

[1] نوح: ۱۹، ۲۰

بلڈنگ کے باشندے اور جائز وارث ہونے کے مستحق ہیں۔ اس زمین و آسمان میں ان کے حقوق ہیں اور وہ مالکِ کائنات کی طرف سے اُن کے حق دار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ اُن کے حقوق کو پامال کرے یا اُنھیں منافع دینے سے بے حق کردے۔ غذا، مکان، تن پوشی اور رہن سہن وغیرہ میں ان سب کے حق دار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق ہے کہ رہنے کے لیے مکان تلاش کریں۔ غذا کے لیے مناسبِ حال کھانا مہیّا کریں اور تن ڈھانکنے کے لیے مناسب بدن پوش مہیّا کریں۔ اندریں صورت جو بھی ان میں سے کسی کے جائز حق میں رخنہ انداز ہوگا وہ بلاشبہ مجرم اور مستحقِ سزا ہوگا۔

اسلام میں حیوانات کے حقوق کی حفاظت: چناں چہ شریعتِ اسلام نے جس طرح انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے اسی طرح حیوانات کے حقوق کی بھی پوری پوری حفاظت و رعایت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اونٹ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں بِلبلاتا ہوا حاضر ہوا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی حضور ﷺ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور بِلبلاتا رہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بلاؤ اس کے مالک کو۔ مالک حاضر کیا گیا۔ فرمایا: یہ اونٹ تیری شکایت کررہا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لادتا ہے۔ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! شکایت بجا ہے، واقعی میں اس جرم کا مرتکب ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چڑیوں کے بچے پکڑ لائے اور ان کی مائیں ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی پریشان حال اُڑ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے وہ بچے چھڑوا دیے کہ کیوں اُن کی آزادی سلب کرتے ہو اور کیوں ان کی ماؤں کو ستاتے ہو۔

کیڑے مکوڑے زمین میں سوراخ کرکے اپنے رہنے کا ٹھکانا کرتے ہیں تو احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ کسی سوراخ کو تاک کر اس میں پیشاب مت کرو۔ اس میں جہاں تمہاری یہ مصلحت ہے کہ اس سوراخ میں سے کوئی کیڑا مکوڑا نکل کر تمھیں تکلیف نہ پہنچادے، وہیں اس جانور کی بھی یہ مصلحت ہے کہ بے وجہ اس کے گھر کو خراب کرکے اسے بے گھر مت بناؤ اور اس

کے ٹھکانے کو گندہ مت کرو کہ اس کا تمھیں حق نہیں۔

آں حضرت ﷺ ایک دن مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، ایک دیہاتی کے یہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی جو آپ کو دیکھ کر چلّائی کہ یا رسول اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے پہاڑی میں میرے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں۔ آپ ﷺ مجھے تھوڑی دیر کے لیے کھول دیجیے کہ میں اُنھیں دودھ پلا آؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! سچّا وعدہ کرتی ہوں۔ آپ ﷺ نے اُسے کھول دیا اور وہ وعدے کے مطابق دودھ پلا کر فوراً واپس آ گئی۔ آپ ﷺ نے اُس کے گلے میں وہی رسی ڈال دی اور اُسے بدستور باندھ دیا۔ اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اسے کھول کر آزاد کر دے۔ چناں چہ اس نے کھول دیا اور وہ اُچھلتی کودتی اور حضور ﷺ کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جا ملی۔

اس واقعے سے واضح ہے کہ حضور ﷺ نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی، جانور کی رعایت تو اس کے کھول دینے سے فرمائی، تا کہ ہرنی کی مامتا کی رعایت ہو اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اس کا دل نہ دکھے۔ بچوں کی رعایت ان کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضایع نہ ہوں، انسانی حقوق کی رعایت یہ ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس ہونے پر دوبارہ باندھ دیا، تا کہ واضح ہو کہ ایک انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اُسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے جس میں رخنہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اور ساتھ ہی اس میں وفائے عہد کی بھی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک پر وفائے عہد لازم ہے تو اس عقل مند انسان پر تو کیوں نہ ہوگا اور واضح کر دیا گیا کہ جب وفائے عہد کا ثمرہ جانور کے حق میں نجات ہے کہ ہرنی کو آزادی مل گئی تو انسان کے لیے دنیا و آخرت میں نجات کیوں نہ ہوگی۔

فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ شہر کے پالتو جانوروں اور کام کاج کے حیوانات کے لیے شہر کے قرب و جوار میں لازمی ہے کہ کچھ زمینیں خالی چھوڑی جائیں جن میں کھیتی باڑی کچھ نہ ہو، تا کہ جانور اس میں آزادی سے چریں اور گھاس اور پانی استعمال کر سکیں اور اُنھیں ان کا جائز حق ملتا رہے اور ان کی آزادی بھی برقرار رہے۔

نیک طبیعت اور پاک نہاد انسانوں نے ہمیشہ ان جانوروں کے حقوق کی رعایت کی ہے، دار العلوم دیو بند کے محدّث حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کھانا کھانے کے بعد روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے اور کنّے تو چھتوں پر ڈلوا دیتے تھے کہ یہ پرندوں کا حق ہے اور کھانے کے ذرّات اور بھورے چیونٹیوں کے سوراخوں پر رکھوا دیتے تھے کہ یہ اس ننھے اور ضعیف جانور کا حق ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کا دل دکھانا اور اُسے ستانا ہرگز جائز نہیں۔ ایک نیک شخص محض اس لیے جہنّم میں جھونک دیا گیا کہ اس نے بلی کو کوٹھڑی میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیا تھا۔ ایک فاحشہ عورت محض اس لیے جنّت میں پہنچا دی گئی کہ اُس نے ایک تڑپتے ہوئے پیاسے کتّے کو پانی پلا کر اس کی جان بچالی تھی، جیسا کہ حدیثوں میں اس کا تفصیل سے واقعہ آتا ہے۔ شریعتِ اسلام نے جانوروں کے ذبیحہ میں اس کی رعایت کا حکم دیا ہے کہ ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح مت کرو کہ اس کا دل دکھے اور وہ اپنے بنی نوع کے ایک فرد کو ذبح ہوتے دیکھ کر وحشت سے خشک ہونے لگے۔

بہرحال حیوانات کے اس دنیا میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور امن و آزادی کے حقوق ہیں، جن کی حفاظت کا حکم اور ان کے ضایع کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ہاں کوئی جانور شرّی اور موذی ہو تو اُسے بے شک بند کر دینے یا مار دینے کے حقوق دیے گئے ہیں۔ سو یہ جانور ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، شریر انسان کے لیے بھی حدود و قصاص، حبس و جیل، قید و بند اور قتل و غارت وغیرہ رکھا گیا ہے۔ چناں چہ موذی جانور مثل سانپ اور بچھّو کو حرم میں بھی پناہ نہیں دی گئی اور قتل الموذیٔ قبل الإیذاء کا معاملہ رکھا گیا ہے، مگر اس سے حیوانات کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنّات کے حقوق: اسی طرح جنّات بھی اس جہان کے باشندے ہیں جن کے حقوق ہیں۔ اُنھیں مکان، غذا اور امن کا حق دیا گیا ہے، جسے پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں، جس طرح وہ ویرانوں میں رہتے ہیں ویسے ہی اُنھیں حق دیا گیا ہے کہ ہمارے گھروں میں بھی بود و باش

اختیار کریں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں بھی جنّات بسے ہوئے ہیں۔ چوں کہ وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ہم اپنے کام میں، اس لیے ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ کوئی جن ہمارے گھر میں آباد ہے۔ البتہ جو بدطینیت اور شرّی، فسادی ہوتا ہے اور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ فلاں گھر میں آسیب کا اثر ہے اور پھر عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ عملیات سے اس جن کو بند کریں یا جلا ڈالیں۔

بہرحال جب جنّات بدی پر آجائیں تو پھر ان کا مقابلہ، بلکہ ان سے مقاتلہ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

جنّات میں مختلف مذاہب: ورنہ جہاں تک نیک اور مؤمن جنّات کا تعلّق ہے ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے گھروں سے اُنھیں نکالنے کی فکر میں رہیں، بلکہ ان کی طاقت اور نیکی سے خود ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ رہی بدی اور ایذا رسانی، سو وہ انسان کی بھی گوارا نہیں کی گئی، چہ جائے کہ جنّات کی کی جاتی۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جنّات میں ہر قسم کے افراد ہیں، نیک ہیں اور بد بھی ہیں، مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، مشرک بھی ہیں اور یہودی و نصرانی بھی۔ چناں چہ قرآنِ کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل جنّات آسمانوں کے دروازوں تک آجاسکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگوؤں سے وحیٔ خداوندی کے کچھ الفاظ اُچک لاتے تھے جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کر کے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے وقت ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بند کر دیا گیا تو اُنھیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا ہے جس نے ہم پر یہ بندش عائد کر دی، اور یہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے جس کی بدولت ہم پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ چناں چہ کچھ جنّات اس وجہ کی تلاش میں نکلے اور مشرق و مغرب میں گھومے، کسی نے مغرب کی راہ لی اور کسی نے مشرق کی، کسی نے شمال کو چھانا اور کسی نے جنوب کو۔ ان میں سے ایک جماعت کا گزر مکّہ میں ہوا تو دیکھا کہ حضور ﷺ قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اس کا طرز و انداز

نرالا اور رہبرانہ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس کی ہدایت کی زَدٹھیک ہمارے شر کے اُوپر ہے، سمجھ گئے کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے ہم پر اور ہمارے شرّی افعال پر یہ پابندی عائد کی گئی ہے۔ انھوں نے جا کر اپنے بھائیوں کو اطلاع دی کہ

﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾[۱] ہم نے ایک عجیب قسم کا پڑھا جانے والا کلام سنا ہے، جو نیکی کے راستہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے، سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔

جس سے معلوم ہوا کہ ان میں کافر بھی تھے جو بعد میں ایمان لائے، تو ان میں کافر و مؤمن کی دونوں نوعیں نکلیں۔ پھر آگے فرمایا:

﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۝﴾[۲] اور ہم اب ہرگز کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان میں موحّد و مشرک کی تقسیم بھی تھی، کچھ مشرک تھے اور کچھ موحّد۔ آگے فرمایا:

﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝﴾[۳] اور یقیناً ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند ہے اس سے کہ اس کے کوئی بیوی اور بیٹا ہو۔

معلوم ہوا کہ ان میں بعض عیسائی بھی تھے، جو عقیدۂ زوجیت اور ابنیّت (یعنی اللہ کے بیوی اور بیٹا ہونے) کے قائل تھے۔ آگے فرمایا:

﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝﴾[۴] اور ہم میں سے بے وقوف اللہ تعالیٰ پر حدّ سے زیادہ جھوٹ اور افترا باندھتے تھے۔

معلوم ہوا کہ ان میں ملحد بھی تھے جو اپنی سفاہت اور بدعقلی سے خدا پر جھوٹ باندھ کر غیرِ دین کو دین باور کراتے تھے اور وحیٔ الٰہی کے نام سے اپنے تخیّلاتِ فاسدہ پھیلانے کے عادی تھے۔

بہرحال اس سے واضح ہوا کہ جنّات میں مختلف فرقے اور مختلف خیالات و عقائد کے

[۱] الجن: ۱،۲ [۲] الجن: ۲ [۳] الجن: ۳ [۴] الجن: ٤

افراد پائے جاتے ہیں، تاہم اس سے ان کے قدرتی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدکاروں کو سزا و سرزنش کی جائے جیسے انسانوں کو کی جاتی ہے، لیکن ان کے حقوق کو نہیں ختم کیا جاسکتا، حتٰی کہ فقہا اس پر بحث بھی کرتے ہیں کہ مسلم جن عورت سے شادی بھی ہوسکتی ہے یا نہیں؟

فقہا کی بحث: بعض فقہا نے اس نکاح کو جائز کہا ہے بعض نے ناجائز، جس کی نظر اس پر ہے کہ نکاح ہم جنس سے ہوتا ہے نہ کہ غیر جنس سے۔ وہ یہ نکاح جائز نہیں قرار دیتے، کیوں کہ یہ نکاح ایسا ہی ہوگا جیسے آدمی بکری یا گائے سے نکاح کرے تو جانور بوجہ غیرِ جنس ہونے کے محلِ نکاح ہی نہیں، اس لیے نکاح نہ ہوگا۔

اور جن کی نظر اس پر ہے کہ جنّات میں شعور ہے اور وہ شریعت کے مخاطب اور احکام کے مکلّف ہیں، نیز انسانی شکل بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ وہ نکاح جائز قرار دیتے ہیں۔

بہرحال جنّات کے مختلف حقوق ہیں، کچھ غذا کے حقوق ہیں، کچھ مکان کے ہیں، کچھ پڑوسی ہونے کے ہیں، یہاں تک کہ کچھ رشتۂ زوجیت کے بھی ہیں، ان کی رعایت لازمی ہے۔

جنّات میں آں حضرت ﷺ کی تبلیغ: حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ کی خدمت میں نصیبین کے جنّات کا ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے بھائیوں کی ایک جماعت فلاں جگہ جمع ہوئی ہے، آپ تشریف لاکر اُنھیں وعظ و نصیحت فرمائیں اور اُن سے متعلق مسائل بیان فرمائیں، ان کے کچھ سوالات بھی ہیں جن کا حل چاہتے ہیں۔ حضور ﷺ تشریف لے گئے، حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ حضور ﷺ جب اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے جس پر جنّات کا اجتماع تھا تو آپ ﷺ نے ایک دائرہ کھینچا اور حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس دائرے سے باہر نہ نکلیں۔ عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عجیب عجیب قماش کے لوگ اس دائرہ کے باہر سے گزر رہے ہیں، لیکن دائرہ کے اندر نہیں آسکتے، اُن کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ بہرحال حضور ﷺ اُن کے مجمع میں پہنچے اور وعظ فرمایا اور مسائل بتلائے۔ اسی میں فرمایا کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجا نہ

کرے اور وجہ یہ فرمائی کہ فَاِنَّهَا زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ (کیوں کہ یہ تمہارے جنّات بھائیوں کی خوراک ہے)۔

جس سے واضح ہوا کہ ان کی غذا کے حقوق کو تلف کرنا جائز نہیں، پھر حدیث ہی میں ہے کہ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کو کھالیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنّات کو ''پُر گوشت'' ہو کر ملتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انسان ہڈی سے استنجا کرتے تھے جس پر جنّات نے حضور ﷺ سے شکایت کی، تو حضور ﷺ نے ہڈی سے استنجا کرنے کی ممانعت فرمائی، جس سے جنّات کے غذائی حقوق کی حفاظت ثابت ہوئی اور یہ کہ ہمیں ان کے حقوق تلف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح مکانات سے بے وجہ اُنھیں اُجاڑنا جائز نہیں، جب تک کہ وہ تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔

حقوقِ ملائکہ: یہی صورت ملائکہ کی ہے وہ بھی اس مکان کے باشندے ہیں، کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں، کچھ زمین میں اور ان کے بھی حقوق ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ چار انگل جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور مشغولِ عبادت نہ ہوں، عالمِ بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالمِ سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے، وہاں سے اُنھیں تکلیف دے کر اُٹھانا جائز نہیں، مثلاً: ملائکہ کو نفرت ہے بد بو سے اور رغبت ہے خوش بو سے، اس لیے ایسے مکانات جو ملائکہ کے اجتماع کے ہیں اُنھیں بد بو سے آلودہ کرنا جائز نہیں، مساجد ملائکہ کے اجتماع کی جگہیں ہیں تو وہاں خوش بو کا مہکانا مطلوب ہے اور بد بو سے بچانا مطلوب ہے، مساجد میں بخور اور خوش بویات کا پھیلانا شرعاً مطلوب ہے تا کہ ملائکہ کو راحت پہنچے اور پیاز کھا کر بِلا منہ صاف کیے مسجد میں جانا مکروہ ہے، تا کہ اُنھیں اذیت نہ ہو۔

حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لیے ملائکہ استغفار کرتے ہیں، جب تک ان کی ریاح خارج نہ ہوں اور وضو نہ ٹوٹے۔ ایسا ہوتے ہی ان کا ستغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ ایسے بندوں سے رُخ پھیر لیتے ہیں۔ گو یا ہم بد بو سے

اُنھیں اُن کے مکان سے اُجاڑ دیتے ہیں، جس کا ہمیں حق نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کی بد بو پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے فرشتہ وہاں سے دور چلا جاتا ہے اور گویا جھوٹ کی گندگی پھیلا کر ان سے ان کا مکان چھین لیتے ہیں، تو آپ کو کیا حق ہے کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی پر ہوں اور اپنی جگہ پر متمکّن ہوں تو آپ اُن کو بھگا دیں اور اُن کی جگہ چھین لیں۔ البتہ جن ناپاک افراد کو پاک مکانوں میں آنے کا حق نہیں ہے اُنھیں نکالا جائے تو بات انصاف کی ہوگی، جیسے حدیث میں ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے تو اُسے بھگا ہی دینا چاہیے۔

بہر حال اسی طرح ملائکہ کی غذا ذکر اللہ ہے تو اس ذکر سے روکنے کی حرکت کرنا ان کی غذا چھین لینا ہے، جیسے پہلے آچکا ہے کہ گندگی پھیلانا یا غفلت کی باتیں کرنا جس سے اُنھیں تشویش اور اذیت ہو، جائز نہ ہوگا۔ بہر حال ملائکہ کے حقوق بھی جنّات اور حیوانات کی طرح ہیں، جن کا تلف کرنا جائز نہیں۔

انسان کے حقوق: چوتھی باشعور مخلوق انسان ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھی زمین و آسمان میں حقوق دیے ہیں۔ کھانے کا حق، لباس کا حق، مکان کا حق، آزادی کا حق، اسے بھی حق تعالیٰ نے اس زمین پر آباد کیا ہے۔ پس ان چاروں مخلوقات حیوان، جنّ، فرشتہ اور انسان کا مکان ہے جس پر وہ آباد ہیں۔ ان چاروں مخلوقات سے حق تعالیٰ کا معاملہ الگ الگ ہے۔ حیوان سے جو معاملہ ہے وہ جنّات سے نہیں، جنّات کے ساتھ جو معاملہ ہے وہ ملائکہ سے نہیں، جنّ و ملک سے جو معاملہ ہے وہ انسان سے نہیں، مثلاً: جانوروں سے یہ معاملہ ہے کہ اُنھیں قابلِ خطاب نہیں سمجھا گیا اور کوئی اَمر و نہی اُنھیں نہیں دیا۔ کوئی قانون ان کے لیے خطابی رنگ کا نہیں اُتارا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، کیوں کہ ان میں فہم خطاب کا مادّہ ہی نہیں، نہ عقل ہے، نہ فہم، اور ہے تو بہت ہی ادنیٰ جو مثل نہ ہونے کے ہے اور وہ بھی صرف اپنے مقاصد کے سمجھنے کے لیے ہے کہ وہ اپنی غذا، رہنے کی جگہ اور دیگر ضروریات کو سمجھ سکیں اور مہیّا کریں۔ مگر وہ

اُمورِ کلیہ اور اپنی تمام بنی نوع کے مفادِ کلّی کو سمجھنے کے لیے کوئی اہلیت نہیں رکھتے۔ صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس۔

حیوانات کا مقصدِ تخلیق: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُنھیں فہم و عقل مل جاتا تو کیا حرج تھا؟ جواب یہ ہے کہ جن مقاصد کے لیے جانوروں کو پیدا کیا گیا ہے ان میں عقل و فہم کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ عقل حارج ہوتی اور وہ مقاصد بھی پورے نہ ہوسکتے۔ ان سے متعلّقہ مقاصد یہ ہیں جنھیں اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم نے فرمایا:

﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ○﴾[1]

اور اسی نے چوپایوں کو پیدا کیا کہ ان میں تمہارے لیے جاڑے کا بھی سامان ہے اور فائدے بہت ہیں اور اُن ہی سے کھاتے بھی ہو اور ان کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جب کہ شام کے وقت لاتے ہو اور جب کہ صبح کے وقت چھوڑ دیتے ہو۔

چناں چہ تم ان حیوانات کے اُون سے گرم کپڑے، پٹّو اور کمبل وغیرہ بناتے ہو۔ ان کھالوں میں تمہارے لیے کئی قسم کے منافع ہیں: اوڑھنے کے، بچھانے کے، زینت کے، خیمے بنا کر رہنے سہنے کے۔ ﴿وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○﴾ اور ان میں سے تم کھاتے پیتے بھی ہو۔ یعنی ان کے گوشت سے فائدہ اُٹھانے کے۔ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ○﴾ اور تمہارے لیے ان جانوروں میں رونق و جمال کا سامان ہے کہ تم ان سے اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر کی شانیں قائم کرتے ہو۔

سرکاری، قومی اور گھریلو تقریبات میں ان کا جلوس نکالتے ہو۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر بیش قیمت زین، قیمتی ہودے اور زرّیں جھولے کَس کر اپنا جاہ و حشم دکھلاتے ہو، جو ایک انتہائی زینت کا مظاہرہ ہے۔

[1] النحل: ۵، ٦

وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَکُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا بٰلِغِیۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ط ۱

اور وہ تمہارے بوجھ بھی ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدون جان کے محنت میں ڈالے ہوئے نہیں پہنچ سکتے تھے۔

حیوانات کو عقل وخطاب سے محروم رکھنے کی حکمت: ان منافع اور حیوانات کے ان خَلقی مقاصد پر غور کرو تو ان کے لیے فہم و عقل کی مطلق ضرورت نہ تھی، بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی، کیوں کہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان ان پر سوار ہوتا، زین رکھتا یا بوجھ لادتا تو عقل مند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے، پہلے یہ ثابت کیجیے کہ آپ کو مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے بھی یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے، وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا، تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی، اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آجاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے، بلکہ ممکن ہوجاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا۔

ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل بات ہوتی۔ ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا۔ نہ بیل کھیت جوت سکتا، نہ گھوڑے سواری لے جاسکتے، نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جاسکتا، نہ ان کی کھال، بال اور دانت وغیرہ سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا۔ سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہوجاتے اور انسانوں کو ان حیوانوں کے مُناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی، اور یہ ساری خرابی حیوانوں کو عقل وفہم ملنے سے ہوتی۔ پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی حیوانات علم حاصل کرنے کے لیے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے، کتے سب جمع رہتے، بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے تو آپ کو علم حاصل کرنا وبالِ جان بن جاتا۔ غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہوجاتے، اس لیے شکر کیجیے کہ اللہ نے اُنھیں عقل وفہم نہ دیا جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔

اِس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عقل نعمت ہے اسی طرح بے عقلی بھی نعمت ہے۔ حیوانات کی بے عقلی ہی سے انسان فائدہ اُٹھا رہا ہے، حتیٰ کہ جو انسان بے عقل اور بے وقوف

۱ النحل: ۷

ہیں وہ عقل مندوں کے محکوم ہیں، جس سے لیڈروں کی حکمرانی چل رہی ہے، بے وقوف نہ ہوتے تو لیڈروں کو غذا نہ ملتی۔ اگر بے فہم نہ ہوتے تو لیڈری کی دکان نہ چل سکتی۔ پس کہیں عقل نعمت ہے تو کہیں بے عقلی نعمت ہے۔ اس لیے جانوروں میں مادّۂ عقل نہ ہونا ہی نعمت ہے، جس سے ان سے مختلف قسم کے کام بلا بحث ومجادلہ نکال لیے جاتے ہیں، ورنہ اگر ان میں عقل ہوتی تو یہ تمام منافع جو انسان ان سے لیتا ہے پامال ہوجاتے۔ حاصل یہ نکلا کہ جانوروں کی پیدایش سے جو مقاصد متعلق ہیں ان سے عقل کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے ان کے فرائض کی وجہ سے اُن کو بے سمجھ رکھا گیا، تاکہ وہ انسان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں اور جب عقل و فہم ان کو نہیں دیا گیا تو ان سے خطاب کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ان کے لیے کوئی شرعی قانون اُتارا جاتا اور وہ مخاطب اور مکلّف بنائے جاتے۔ پس ان کے لیے نہ اَمر ہے، نہ نہی، نہ شریعت آئی، نہ کوئی تشریحی قانون۔ صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے، جس سے وہ کام پر لگے رہتے ہیں اور روز وشب مشغول ومنہمک ہیں۔

ملائکہ سے نوعیّتِ خطاب: ملائکہ کو خطاب تو کیا مگر خطابِ تکلیفی نہیں کیا کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو، بلکہ خطابِ تشریفی کیا جو اعزازی وتکریمی ہے، جیسے بادشاہ کسی مقرّب سے باتیں کرے تو اس سے اس کی عزت بڑھانی اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ پابند بنانا۔ پس ملائکہ سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا، کلام بھی فرمایا، گفتگو بھی کی، مگر اس پر کوئی شریعت نہیں اُتاری، کیوں کہ احکام دو ہی قسم کے ہوتے ہیں یا کرنے کے یا بچنے کے۔ کرنے کے کام خیر کے ہوتے ہیں جن سے خیر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور بچنے کے کام شرّ کے ہوتے ہیں جس سے شرّ کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے، جیسے: بدکاری، دغابازی، رشوت ستانی، زناکاری، شراب خوری، چوری، سرزوری، بغاوت، تمرّد اور سرکشی وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شرّ اور بُرائی کا مادّہ ہی نہیں رکھا گیا تو اُنھیں بچنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ بدی کر نہیں سکتے تو ان میں بدی سے بچنے کا حکم دینا عاجز کو اَمر کرنا تھا، جو سراسر خلافِ حکمت ہے اور حق تعالیٰ حلیم مطلق ہے وہ خلافِ حکمت بات سے بَری اور منزّہ ہے،

رہی خیر، تو وہ اُن کا طبعی تقاضا ہے، جسے وہ بہ تقاضائے طبیعت کرنے پر مجبور ہیں اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں مصروف رہتے ہیں، عبادت کرتے ہیں اور اپنی طبعِ پاک ہی سے منشائے خداوندی کو بھی پہچانتے ہیں، اس لیے ان کو شریعت کے پہنچوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اُنھیں اَمرِ خیر کرنے کے لیے کسی قانون سے تنبیہ کی جاتی۔

پس جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا، سونا جاگنا وغیرہ ایک طبعی بات ہے، خواہ کوئی شریعت آئے یا نہ آئے انسان اس پر مجبور ہے کہ کھائے پیے، اس لیے ان اُمورِ طبعیہ پر آمادہ کرنے کے لیے کسی شریعت کی ضرورت نہ تھی، اگر شریعت نہ بھی ہوتی تب بھی ہم پیاس کے وقت پانی پیتے اور بھوک کے وقت کھانا کھاتے، تو جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا طبعی بات ہے اسی طرح تمام اُمورِ خیر، عبادت، نیکی، پاک دامنی، صفائے باطن وظاہر اور سلامتی، ملائکہ کے حق میں طبعی بات ہے شریعت آئے یا نہ آئے وہ اپنے تقاضائے طبع سے ہمیشہ نیکی ہی کریں گے۔ اس لیے اُمورِ خیر کے لیے بھی اُنھیں کسی شرعی تکلیف اور قانونی خطاب کی ضرورت نہ تھی۔

بہرحال ملائکہ کو نہ اَمرِ شرعی کی ضرورت ہے نہ نہیِ شرعی کی، اس لیے ان سے خطابِ تکلیفی نہیں کیا گیا۔ صرف تشریفی اور تکریمی کیا گیا۔

جنّات سے نوعیّتِ خطاب: پس جانوروں سے تو خطاب ہی نہیں کیا گیا۔ ملائکہ سے خطاب تو کیا گیا مگر تکلیفی خطاب نہیں کیا گیا۔ رہے جنّات تو ان سے خطاب تو کیا گیا مگر تکلیفی خطاب ہی کیا گیا۔ مگر خطاب مستقل نہیں کیا گیا، یعنی خود اُن پر براہِ راست کوئی شریعت نہیں اُتاری گئی اور نہ براہِ راست اُن کی نوع کو کوئی شرعی تکلیف دی گئی۔ بلکہ انسان کے واسطہ سے ان ہی کی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور ان کو دین میں انسانوں کے تابع رکھا گیا۔ چناں چہ ان میں جو یہودی ہیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، خود تورات جنّات پر نہیں اُتری۔ جو نصاریٰ ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں، انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اُتری اور جو مسلمان ہیں وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابعِ فرمان بنائے گئے ہیں۔ خود قرآنِ پاک براہِ راست اُن پر نہیں اُتارا گیا۔ پس جو شریعت انسانوں کے لیے آئی ہے وہی ان کے لیے بھی آئی ہے، مگر بہ واسطۂ

انسان اُنھیں پابندِ شریعت بنایا گیا۔

جنّات میں نبوّت نہ رکھنے کی وجہ: بہ الفاظِ دیگر ان میں نبوّت نہیں رکھی گئی، وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ ہے اور شرّ کالعدم ہے، جنّات میں شرّ کا غلبہ ہے اور خیر کالعدم ہے اور نبوّت کے لیے غلبۂ خیر ہی نہیں خیرِ محض کی ضرورت تھی، ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بدفہمی یا بدعملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا۔ اس لیے اُنھیں تابعِ انسان بنایا گیا، تاکہ اس کی شریعت سے وہ علم و عمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں۔ اس لیے جو انبیا انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئی۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا، ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنّات کو خطاب تخلیقی کیا مگر خطابِ بالاستقلال نہیں فرمایا۔

انسان کو مستقلاً خطاب: اور انسانوں کو تکلیفِ شرعی بھی دی اور مستقلاً خطاب بھی فرمایا۔ یعنی اپنی وحی کے ذریعے خود اُن سے کلام فرمایا۔ اُن میں نبی اور رسول بنائے۔ کبھی براہِ راست خود خطاب فرمایا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طُور پر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شبِ معراج میں اور کبھی بہ زبانِ مَلکی خطاب فرمایا۔ پھر فرشتہ کبھی اپنی مَلکیّت پر رہتا اور انبیا بشریت سے مَلکیّت کی طرف منتقل ہو کر فرشتے سے ملتے اور کبھی فرشتہ اپنی صورتِ مَلکی کو چھوڑ کر صورتِ انسانی میں آتا اور انبیا بشری چولا میں اُسے دیکھتے، جس کو قرآنِ حکیم میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾[1]

اور کسی بشر کی حالتِ موجودہ میں یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمائے مگر تین طریق سے: یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتے کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے، پیغام پہنچا دیتا ہے۔

پہلی صورت فرشتہ کے قلب پر وارد ہونے کی ہے جس میں وہ اپنی اَصلیت پر رہتا ہے، لیکن

[1] الشوریٰ: ۵۱

پیغمبر کو بشری اَصلیت سے مَلکیّت کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے، اس لیے یہ صورت حضور ﷺ پر نہایت بھاری اور شدید ہوتی تھی۔

دوسری صورت حق تعالیٰ کے براہِ راست کلام فرمانے کی ہے، جو پسِ پردہ رہ کر ہوتی تھی۔ یعنی نگاہیں حق تعالیٰ کو نہیں دیکھتی تھیں صرف کان کلامِ حق سنتے تھے۔

اور **تیسری صورت** فرشتہ کی انسانی صورت میں آکر پیغامِ خداوندی سنانے کی ہے، جس میں پیغمبر اپنی بشری اصلیت پر قائم رہتے تھے فرشتہ کو ملکی چولا چھوڑ کر بشری چولا میں آنا پڑتا تھا۔ یہ تینوں صورتیں وحیٔ الٰہی کی تھیں۔

علم اور وحیٔ الٰہی کے لیے انسان کا انتخاب: حاصل یہ ہے کہ وحیٔ الٰہی اور نبوّت و شریعت کی دولت سے مخلوق میں بجز انسان کے اور کسی کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور ظاہر ہے کہ وحی علم کے اُتارنے ہی کو کہتے ہیں۔ وحی کے ذریعے علم ہی تو رسول کو دیا جاتا ہے، اس لیے دوسرے لفظوں میں علمِ الٰہی کی نعمت مستقلاً انسان ہی کو دی گئی ہے، جس کو اس کی بنیادی خصوصیّت اور امتیازی نشان سمجھنا چاہیے، کیوں کہ خصوصیّت کے معنی یہی ہیں کہ اس کے سوا کسی دوسرے میں نہ پائی جائے۔ اس لیے دوسرے لفظوں میں انسانیت کی خصوصیّت علمِ وحی نکل آتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی خصوصیّت اس میں سے نکال دی جائے تو وہ چیز باقی نہیں رہ سکتی۔

اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انسان کو علمِ وحی حاصل نہ ہو تو وہ انسان انسان نہ رہے گا کہ انسانیت کی خصوصیّت اس میں نہ آئی یا نہ رہی۔ گو اس کی صورت انسانوں جیسی ہو۔ سو ظاہر ہے کہ انسان نام انسانی صورت کا نہیں بلکہ انسانی جوہر کا ہے۔ اور انسانیت کا یہ جوہر یہ علمِ وحی ہے۔ اس لیے جو انسان علمِ وحی کا حامل نہیں وہ دلائلِ بالا کی رُو سے انسان نہیں صرف صورتِ انسان ہے، اور محض صورت کی جس میں حقیقت نہ ہو، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر ہم گھوڑے کا مجسّمہ بالکل اصلی گھوڑے جیسا بنالیں کہ دیکھنے میں اصل و نقل میں ذرّہ بھر فرق معلوم نہ ہو، تو کیا اُسے گھوڑا کہیں گے؟ اور کیا وہ گھوڑے کی طرح سواری دے سکے گا؟ اور کیا اس کی قیمت بھی ہزار پانچ سو روپیہ اُٹھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ کیوں کہ وہ گھوڑا نہیں گھوڑے کی محض تصویر ہے۔

اسی طرح اگر انسان کا اصلی مجسّمہ سامنے ہو مگر اس میں انسانی جوہر اور انسانی خصوصیّت (علم) نہ ہو تو وہ صورتِ انسان ہے، انسان نہیں۔ اور قدر و قیمت انسان کی ہوتی ہے صورتِ انسان کی نہیں۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ انسانی صورتیں پلاسٹک کی بنی ہوئی چند پیسوں میں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ چاہیے کہ انسانوں سے قطع نظر کر کے ان پلاسٹک کے انسانوں سے انسانوں کے کام لینے لگیں اور اصل انسان کے پیچھے نہ پڑیں۔ مگر ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس سے واضح ہے کہ دنیا میں قدر و قیمت انسان کی ہے، تصویرِ انسان کی نہیں اور آدمی حقیقتِ آدمیت کو کہتے ہیں، محض صورتِ آدمیت کو نہیں۔

گر بہ صورتِ آدمی انسان بدے — احمد و بوجہل ہم یکساں بدے
اینکہ می بینی خلافِ آدم اند — نیستند آدم خلافِ آدم اند
ازبروں چو گور کافر پر حلل — واندروں قہرِ خدائے عزّ و جل

انسان کا ممتاز علم: یہاں ایک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ انسان کی خصوصیّت مطلق علم نہیں، یعنی ہر قسم کے علم کو انسانی خصوصیّت نہیں کہا جائے گا۔ کیوں کہ مطلق علم یعنی علم کی کوئی نہ کوئی نوع تو قریب قریب ہر مخلوق کو حاصل ہے، حتّٰی کہ جانور بھی علم سے خالی نہیں، اس لیے مطلق علم انسانی خصوصیّت نہیں کہلائی جاسکتی اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت و شرافت اور مخلوقات میں افضلیت نمایاں ہوسکتی ہے، جب تک کہ اُسے کوئی ایسا علم حاصل نہ ہو جو اس کے سوا کسی کو حاصل نہ ہو۔

آج کی دنیا میں علم کی رائج شدہ جتنی بھی قسمیں ہیں ان میں سے کوئی بھی انسان کی خصوصیّت نہیں۔ جانوروں کو بھی ان سے حصّہ ملا ہوا ہے۔ اس لیے بھی انسان اپنی افضلیت اور مخلوقات میں اپنی برتری ان غیر مخصوص علوم سے نہیں جتا سکتا۔ آج اگر انسان دعویٰ کرے کہ میں اس لیے افضل المخلوقات ہوں کہ میں انجینئری کا علم جانتا ہوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائنوں کی کوٹھیاں اور بلڈنگیں تیار کرسکتا ہوں تو یہ دعویٰ قابلِ سماع نہ ہوگا۔ کیوں کہ انجینئری کے علم سے جانور بھی خالی نہیں ہیں۔ وہ بھی دعویٰ کرسکیں گے کہ ہم بھی انجینئر ہیں اور اپنے مناسبِ

حالِ راحت وہ مکانات بناتے ہیں۔ بیّا (جو ایک چھوٹی سی چڑیا ہے) اپنے لیے عجیب وغریب قسم کا گھونسلا بناتا ہے جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں۔ ماں باپ کا الگ اور بچوں کا الگ، حتیٰ کہ اس میں بچوں کے لیے جھولا بھی ہوتا ہے جس میں بچے جھولتے ہیں، گویا مختلف قسم کے روم ہوتے ہیں۔ یہ گھونسلا درخت میں لٹکا ہوا ہوتا ہے، لیکن مضبوط اتنا کہ آندھی آئے، طوفان آئے، مگر اس مکان پر کوئی زَد نہیں پڑتی۔ کیا یہ اعلیٰ ترین صنعت نہیں ہے اور یہ چڑیا کیوں یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ میں بھی انجینئر ہوں؟ ضرور کرسکتی ہے۔ تو پھر انجینئرَی انسان کے حق میں مخصوص کہاں رہی جو اس کی افضلیت اس چڑیا پر ثابت ہو۔ شہد کی مکھی اپنا چھتّا بناتی ہے۔ اس کے ہشت پہلو سوراخ اس قدر مساوی ہوتے ہیں کہ آپ پرکار سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بناسکتے۔ پھر اس میں بچوں کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں، جو نہ بارش میں خراب ہوتا ہے، نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہلتا ہے۔ کیا یہ انجینئرَی اور کاری گری نہیں ہے؟ اگر ہے اور بلاشبہ ہے تو آپ کو کب حق پہنچتا ہے کہ آپ انجینئرَی کا فن اپنی نوع کے ساتھ مخصوص بتلا کر اس مکھی پر اپنی فضیلت و برتری ثابت کرسکیں؟ سانپ اپنی بمی مٹی سے بناتا ہے جو اُوپر سے بُرجیوں دار گنبد کی مانند ہوتی ہے اور اس کے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ بنی ہوئی جن میں سانپ اور ان کے بچے رینگتے رہتے ہیں۔ کیا اسے انجینئرَی اور صنعت کاری نہیں کہیں گے؟

رہا یہ کہ آپ کہیں کہ ہم عمارتیں بڑی عالی شان بناتے ہیں جن کی خوش نمائی اور نفاست ان گھونسلوں اور بھٹوں سے کہیں زیادہ اونچی اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اور یہ جانور انجینئرَی میں برابر کیسے ہوسکتے ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ مکان کا عمدہ ہونا مکین کی ضرورت اور راحت کے لحاظ سے ہوتا ہے، جانور اپنی ضرورت کی رعایت کرتا ہے، آپ اپنی ضروریات کی۔ اگر جانور آپ کی کوٹھی کو للچائی نظروں سے دیکھتا تو آپ اپنی برتری کا دعویٰ کرسکتے تھے، لیکن جیسے آپ اس کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ آپ کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر آپ سانپ یا بیّا یا شہد کی مکھی کو اپنی کوٹھی میں آباد کرنا چاہیں وہ کبھی بھی آمادہ نہ ہوگا، بلکہ اپنا ہی مکان بنا کر رہے گا۔ اس سے واضح ہے کہ مکان کی صنعت میں دونوں برابر

ہیں اور اپنے اپنے رنگ کے ماہر ہیں۔ اس لیے انجینئری کے بارے میں آپ کو دعوائے فضیلت کا کوئی حق نہیں۔

اسی طرح مثلاً علمِ طب ایک تجرباتی علم ہے۔ یہ علم جس طرح انسان کو حاصل ہے اسی طرح حیوانوں میں بھی یہ علم اپنی اپنی بساط کی قدر پاتا جاتا ہے۔ آپ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ہم طبیب ہیں اور ہمیں ہی اس علم کا شرف حاصل ہے۔ لہٰذا ہم ہی اس فن کی رُو سے اشرف المخلوقات ہیں، غلط ہے۔ جانور بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمیں ہی علمِ طب میں مہارت ہے۔ فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ آپ پر زیادہ بیماریاں آتی ہیں تو آپ دواؤں کی زیادہ اقسام جانتے اور استعمال کر سکتے ہیں، جانوروں کو بیماریاں کم لاحق ہوتی ہیں اس لیے وہ دوائیں بھی کم جانتے ہیں، لیکن اس کمی بیشی کے فرق سے علمِ طب صرف آپ کی خصوصیت قرار نہیں پا سکتا۔

ایک چشم دید مثال: تقسیم سے قبل مجھے ایک ہندو ریاست اندر گڑھ میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میرے بعض اعزّہ اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اس ریاست میں بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی۔ اس لیے بندروں کی تعداد ہزاروں کی حدّ تک تھی۔ بندر کی جبلّت میں شرارت اور چالاکی بلکہ ایذا رسانی داخل ہے، اس لیے وہ کافی نقصان کرتے تھے۔ کبھی برتن اُٹھا کر بھاگ جاتے، کبھی کپڑا اُٹھالے جاتے۔

اس لیے ایک بار ہم نے سوچا کہ کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ اس لیے ہم نے ایک روپیہ کا سنکھیا خریدا اور اُسے آٹے میں ملایا اور روٹیاں پکوا کر چھت پر پھیلا دیں تاکہ وہ کھائیں اور مرتے جائیں۔ اس لیے ہم روٹیاں چھت پر ڈال کر خود ایک گوشے میں بیٹھ کر منتظر رہے کہ اب بندر آکر ان روٹیوں کو کھائیں گے اور مریں گے۔ کچھ بندر آئے مگر ان روٹیوں سے دور کھڑے ہوکر دیکھنے لگے کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا کہ روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ بات ہے، ورنہ روٹیاں یوں نہیں بکھیری جا سکتیں۔ اس لیے روٹی کو غور سے دیکھا، پھر سونگھا۔ بالآخر انھوں نے روٹی کو ہاتھ نہیں لگایا اور چلے گئے۔ ہم سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی، لیکن بندروں کا یہ چالاک قافلہ جا کر پھر اپنے ساتھ اور بندروں کو لایا اور چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر ان کے

ہم راہ آئے اور روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک آگے بڑھا اور اُس نے روٹیوں کو سونگھا، پھر دوسرا آگے بڑھا اور اس نے ایک روٹی توڑی اور اس کے ٹکڑوں کو سونگھا اور روٹیاں چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔

اب ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ سب کچھ سمجھ گئے ہیں اور ہماری ساری تدبیر ناکام ہوگئی، مگر تھوڑی ہی دیر میں تقریباً ساٹھ ستر بندروں کا ایک قافلہ آیا اور اُن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹہنی تھی جن میں ہرے ہرے پتے تھے، اُنھوں نے آکر پہلے روٹیوں کو توڑا، اُن کے ٹکڑے کیے، گویا پوری جماعت میں یہ اصول پیشِ نظر تھا کہ

نیم نانے گر خورد مردِ خدا بدل درویشان کند نیمے دگر

بندر بانٹ تو مشہور ہے۔ آخر کار انھوں نے وہ ٹکڑے باہم بانٹ لیے اور ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھا کر اُوپر سے وہ پتے چبالیے جو ہر ایک اپنی ٹہنی ساتھ لایا تھا۔ اور دندناتے ہوئے چلے گئے اور ہم دیکھتے رہ گئے۔ اپنا آٹا بھی گیا۔ کپڑا تو پہلے ہی جاچکا تھا۔ اور اُوپر سے وقت بھی ضائع ہوا۔ اندازہ یہ ہوا کہ یہ پتے جو وہ ساتھ لائے تھے زہر کا تریاق تھے، جو ان بندروں کو معلوم تھا۔ اب بھی اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ طبیب صرف ہم ہی ہیں جو جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں جانتے ہیں تو یہ دعویٰ غلط ہوگا، کیوں کہ یہ بندر بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم بھی طبیب ہیں جو زہر خوردہ کا علاج کر سکتے ہیں اور جب یہ واضح ہوگیا کہ جانوروں میں بھی اَطبّا اور معالج موجود ہیں اور وہ بھی حسبِ ضرورت دوا استعمال کر کے دُکھ درد کا دفعیہ کر سکتے ہیں، بلکہ پیش بندی کر کے بیماری کو پہلے ہی سے روک دیتے ہیں، تو فنِ طب میں ان کا دخل معلوم ہوا۔ پھر آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہے کہ صرف ہم ہی اَطبّا ہیں اور فنِ طب کی وجہ سے جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ اور بندر نفسِ فن میں برابر ہوگئے۔ گو کچھ خصوصیات کا فرق ہی سہی۔

فنِ سیاست بھی حیوانات میں پایا جاتا ہے: پھر اگر آپ یہ کہیں کہ طب نہ سہی فنِ سیاست سہی۔ ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی مِلّت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظّم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم اس بارے میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں، تو

میرے خیال میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فنِ سیاست بھی انسانی خاصہ نہیں، بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ شہد کی مکھی بھی ملّت کی سیاسی اور انتظامی تنظیم کر سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتّا بناتی ہیں اور بے نظیر انداز میں اس میں ہشت پہلو سوراخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ اپنا امیر منتخب کرتی ہیں جس کا نام عربی زبان میں ''یعسوب'' ہوتا ہے۔ یہ امیر اس چھتّے پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں۔ اندرونِ قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتّے کے ایک حصّے میں تو شہد بھرا جاتا ہے اور ایک حصّے میں ان کے بچے ان خانوں میں پلتے ہیں، ایک حصّے میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے، حتیٰ کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھتّے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہیں۔ کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتّے پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادّہ چوس کر آتی ہے جس سے بنے ہوئے شہد میں یقیناً سَمِّیَّت کا سرایت کر جانا یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اُسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادّہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اُسے فوراً مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتّے کے اندر نہ گھسنے پائے، تاکہ اُس کے زہریلے مادّے سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک کی جان لے کر اگر پوری قوم کو بچا لیا جائے تو کوئی جرم نہیں۔ یعنی اس کی سیاست اُسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾[1] ''یعنی ایک موت سے اگر پوری قوم کی حیات بچ جائے تو اس موت میں کوئی مضایقہ نہیں۔''

اس قتلِ نفس پر مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے، نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خوش دلی سے امیر کے اس فعلِ قتل پر گردن جھکا دی جاتی ہے اور کسی کو یہ خلجان نہیں گزرتا کہ یہ کیوں ہوا؟ بلکہ تمام قوم سرِ اطاعت جھکا کر مان لیتی

[1] البقرة: ۱۷۹

ہے۔ تو اولوالاَمر کا انتخاب، پھر اس کے سامنے سمع و اطاعت، پھر قوم کی انتظامی تشکیل اور نظم کے تحت مکانات کی تقسیم، پھر بے راہ روی پر مجرم کا قتل، اگر سیاست نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

ضلع بجنور کے ایک قصبہ نجیب آباد میں شہد بہ کثرت ہوتا ہے اور وہاں پر شہد کی مکھیوں کو پالنے کا خاص انتظام ہوتا ہے۔ وہاں کا ہم نے ایک محاورہ سنا کہ فلاں نے اپنی بیٹی کو تین مکھیاں جہیز میں دیں۔ فلاح نے چار مکھیاں جہیز میں بیٹی کو دیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ جہیز میں پلنگ، پیڑھیاں، میز، کُرسیاں، زیور، کپڑا وغیرہ تو دنیا بھر میں دیا جاتا ہے۔ یہ مکھیاں جہیز میں دینے کے آخر کیا معنی ہیں؟ تحقیق سے معلوم ہوا کہ جب وہ لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں اور کسی خاص جگہ شہد کا چھتّا لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر مکھی کو یعنی یعسوب کو پکڑ کر اس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہوجاتی ہیں۔ چھتّا بناتی ہیں اور وہاں شہد تیار ہوجاتا ہے۔ اس گُر کو سامنے رکھ کر وہاں کے یہ شہد کے کاروباری دو چار امیر مکھیاں پکڑ کر اور ڈبیہ میں بند کر کے بیٹی کو جہیز میں دے دیتے ہیں، وہ لڑکیاں ترکیب جانتی ہیں اور مناسب مقام پر ان مکھیوں کو بٹھلا دیتی ہیں، تو وہیں شہد کے چھتّے لگ جاتے ہیں اور کئی کئی دھڑی شہد ہوتا ہے۔ تو چار مکھیاں جہیز میں دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار دھڑی شہد جہیز میں دے دیا گیا۔ اس سے شہد کی مکھیوں کی اطاعت شعاری اور نظم پسندی معلوم ہوئی۔ جس کی نظیر انسان میں بھی نہیں ہے۔

سو اس نظم پسندی اور تنظیمِ ملّت کی اعلیٰ ترین سیاست کے ہوتے ہوئے آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہوگیا ہے کہ انسان ہی صرف سیاست دان ہیں۔ یہ مکھیاں بھی دعویٰ کرسکتی ہیں کہ ہم بھی سیاست دان ہیں۔ تو اگر آپ بھی کسی امیر کے تحت رہ کر تقسیم عمل کرلیں کہ کوئی غذا مہیّا کرے، کوئی تعلیم کا کام کرے، کوئی فوج میں بھرتی ہوکر ملک کی حفاظت کرے، تو ہر کام بلاشبہ عمدہ ہے۔ ضروری بھی ہے۔ مگر محض انسان کی خصوصیّت نہیں، مکھیاں بھی کرسکتی ہیں۔ اس لیے یہ تنظیم کوئی وجہ فضیلت نہیں کہ انسان اپنے کو حیوانات سے برتر سمجھے۔

بطخوں میں سیاست و تنظیم: بطخوں میں بھی سیاست پائی جاتی ہے۔ جب بطخیں سوتی ہیں تو اُن کا امیر اُن کی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے۔ وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا

ہے، جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں اور پَر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز میں اُٹھ کر پرواز میں آجاتی ہیں اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اُڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اُڑتی ہیں۔ جدھر امیر جاتا ہے اُدھر تمام بطخوں کا یہ قافلہ جاتا ہے۔ کسی کو امیر پر اعتراض نہیں ہوتا کہ وہ اس سمت میں کیوں جا رہا ہے؟ پھر جہاں امیر بیٹھتا ہے تمام بطخیں وہیں اُتر پڑتی ہیں۔ یہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس سے بہتر سیاست اور تنظیم کیا ہو سکتی ہے؟ اپنی رعایا اور ماتحت قوم کو ہر خطرے سے آگاہ کرنا اور بچانا۔ خود بیدار رہنا، اُن کو چوکنا رکھنا کیا اعلیٰ ترین ترقی یافتہ سیاست نہیں؟

اس لیے سیاسی تدابیر اور جوڑ توڑ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اصولِ سیاست میں حیوانات بھی اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مکھیاں کہیں گی کہ ہم بھی سیاست دان ہیں۔ بطخیں کہیں گی کہ ہم بھی سیاست دان ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کی سیاست شاخ در شاخ ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ملّت میں جرائم زیادہ ہیں اس لیے روک تھام کی تدابیر بھی زیادہ ہیں۔ مکھیوں اور بطخوں میں جرائم کی انواع آپ سے کم ہے تدابیر بھی کم ہیں۔ سو اس سے کچھ ان مکھیوں اور بطخوں کی فضیلت ہی آپ پر ثابت ہوگی نہ کہ کم تری اور اصل سیاست میں برابری ثابت ہوگی، تو یہ دعویٰ بھی آپ کا غلط ہے کہ ہم چوں کہ فنِ سیاست سے واقف ہیں اس لیے افضل الحیوانات ہیں۔

مکڑی کی صنعت کاری: اگر آپ کہیں کہ ہم کپڑا بُننے کا فن جانتے ہیں لہٰذا ہم سب جانوروں میں افضل ہیں۔ تو مکڑی آکر یہ کہے گی کہ یہ کام تو میں بھی جانتی ہوں۔ دیکھیے! مکڑی سفید رنگ کا خیمہ تانتی ہے جس کی طنابیں چاروں طرف کھنچی رہتی ہیں۔ وہ اتنا صاف، باریک اور ملائم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کی ململ بھی اتنی صاف اور باریک نہیں ہوتی، اور اتنا مضبوط جس کو آندھی، ہوا کے سخت جھونکے اور بڑی سے بڑی بارش بھی نہیں ہلا سکتی۔ اس کی طنابیں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں سرکتیں۔ آپ تو سُوت سے کپڑا بُنتے ہیں وہ خدا جانے کس مادّے سے اپنا گھر

بناتی ہے۔آپ کا کپڑا پھٹ جائے گا مگر اس کا بنا ہوا خیمے کا یہ کپڑا اور خیمہ نہیں پھٹے گا۔آپ کا بنایا ہوا کپڑا میلا ہوجائے گا جسے آپ پانی سے دھوئیں گے۔صابن سے صاف کریں گے، مگر مکڑی کے اس خیمے کے کپڑے کو صاف کرنے اور دھونے کی ضرورت ہی نہیں۔

آپ کہیں گے کہ ہم اپنی غذا کے لیے پرندے پھانسنے کے لیے جال بناتے ہیں، مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال بُنتے ہیں، تو ہماری تدبیر کو کون پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیر نوع کو قابو میں لانے کے لیے سُوت کے تاگوں سے کام لے لیتے ہیں۔تو بھی مکڑی آگے بڑھ کر کہے گی کہ میں اس سے بہتر جال تن سکتی ہوں۔ وہ جالا تانتی ہے تو اس میں مکھیاں پھنس جاتی ہیں، چلّاتی ہیں مگر اس جال سے نہیں نکل سکتیں۔تو کیا یہ غیر نوع کا قابو میں لانا نہیں۔اور پھر اتنا باریک تار بناتی ہے کہ آپ کا سُوت اتنا باریک نہیں ہوتا۔

غرض آپ فنونِ طبیعہ میں سے کون سے فن کو اپنی خصوصیّت کہہ سکیں گے۔ضروریاتِ زندگی کا کوئی ایسا فن نہیں جو حیوانات میں نہ ہو۔ہم جس قدر بھی ضروریاتِ زندگی سے متعلق علم رکھتے ہیں۔حیوانات بھی اپنی ضروریاتِ زندگی سے متعلق سمجھ بوجھ اور صنعت کاری کا علم رکھتے ہیں۔

حتیٰ کہ اگر آپ سائنس کی مدد سے ۵۰ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرسکتے ہیں تو ایک کوّا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے اپنے پروں سے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔آپ پیتل، تانبے اور دیگر معدنیات کے بنائے ہوئے مصنوعی پروں یعنی ہوائی جہازوں کے ذریعے اُڑتے ہیں اور چیل کوّے وغیرہ پرندے اپنے بنے بنائے پروں اور خلقی طاقت سے اُڑتے ہیں۔آپ ان مصنوعی پروں میں معدنیات کے محتاج ہیں اور ہوائی جہاز بنانے میں خون پسنہ ایک کرتے ہیں تب کہیں اُڑتے ہیں اور یہ پرندے خود ہوائی جہاز ہیں۔غرض آپ اگر اُڑ گئے تو پرندے بھی اُڑتے ہیں۔یعنی پرواز کا جو فعل آپ نے کیا وہی پرندوں نے بھی کیا۔آپ نے کپڑا بُن کر تن پوشی کی ہے اور بدن کو کپڑوں سے چھپایا، تو ہر پرند چرند بھی اپنی کھال، اپنے پروں سے اپنے تن بدن کو چھپاتا ہے۔آپ کا لباس مصنوعی ہے، اس کا قدرتی ہے۔آپ رہنے کے لیے مکان بناتے ہیں، جانور بھی اپنا بھٹ اور گھونسلا بناتے ہیں۔آپ اپنا

رزق تلاش کرنے جنگل میں جاتے ہیں، وہ بھی اپنی غذا تلاش کرنے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہیں، وہ گھاس دانہ کھاتے ہیں۔ آپ گوشت پکا کر کھاتے ہیں، وہ اس مصیبت سے بَری ہیں، کچا ہی کھالیتے ہیں۔ آپ اگر ان کے گھاس دانے سے نفرت کرتے ہیں تو وہ آپ کے زردہ پلاؤ سے نفرت کرتے ہیں۔

طبعی علوم انسان کے لیے وجہ امتیاز نہیں ہیں: غرض کوئی طبعی فن ایسا نہیں ہے جن میں وہ آپ کی ہم سری کا دعویٰ نہ کرسکیں۔ آپ سیاست کے مدعی ہوں گے تو شہد کی مکھی اور بطخ سامنے آکر اس دعوائے خصوصیّت کو باطل کردے گی۔ آپ کپڑا بُننے اور جال بنانے کے فن کا دعویٰ کریں گے تو مکڑی سامنے آکر بولے گی کہ یہ کام میں بھی کرسکتی ہوں۔ آپ فنِ طب کی مہارت کا دعویٰ کریں گے تو بندر اُچھل کر کہے گا کہ جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں کچھ میں بھی جانتا ہوں اور میں زہر کا تریاق جانے ہوئے ہوں۔ آپ فنِ پرواز کے مدعی ہوں تو پرندے سامنے آکر کہیں گے کہ ہم فنِ پرواز میں تم سے زیادہ ماہر ہیں۔ آپ انجینئری اور فنِ خانہ سازی کے مدعی ہوں گے تو ہر چرند پرند اور درندے آپ کے مقابلے میں آکر کہیں گے کہ یہ کام ہم سب جانتے ہیں۔ رہنے سہنے، لباس پہننے، علاج کرنے، مکان بنانے اور تنظیم وسیاست کاری کرنے میں شریک ہیں۔ تو ان فنون کی وجہ سے تو انسان ان جانوروں سے افضل نہیں ہوسکتا۔

انسان کا امتیاز: افضلیت کسی خصوصیّت کی بنا پر ہوتی ہے جو اس میں ہو اور دوسروں میں نہ ہو۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں میں ہے اور اس کے سوا اور کسی میں نہیں وہ علمِ شرائع اور علمِ احکامِ خداوندی ہے، جس سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے، اور انسان اس علم کے ذریعے سعادت کے درجات طے کرتا ہے اور عنایتِ خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ یہ علم کسی بھی غیر انسان میں نہیں پایا جاتا۔ نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے، نہ جنّات اس علم سے آراستہ ہیں۔ نہ حیوانات واقف ہیں اور جمادات ونباتات تو کیا واقف ہوتے؟ یہ علم خصوصیّت ہے انسان کی، علمِ شرائع ہی صرف انسان کی وہ خصوصیّت ہے جس نے اُسے سب مخلوقات پر فوقیت وفضیلت دی۔

علم شریعت کی حقیقت: جس کی یہ وجہ ہے کہ یہ علم بغیر پیغمبری کے نہیں آ سکتا، کیوں کہ یہ علم اللہ کی مرضیات و نامرضیات کے جاننے کا علم ہے اور کسی کی مرضی بلا اس کے بتلائے ہرگز معلوم نہیں ہوسکتی۔ اور اللہ ہر کس و ناکس کو اپنے اندر کی بات نہیں بتلاتا۔ سو اس کے لیے اس نے نوعِ انسانی کو مخصوص فرمایا۔ اور اس میں بھی برگزیدہ تر طبقہ انبیا علیہم السلام کا تھا، تو اس نے اُنھیں اپنی مرضیات و نامرضیات سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوتا ہوں اُسے کرو، اور فلاں چیز سے ناخوش ہوتا ہوں اُسے نہ کرو، یعنی اَمر و نہی کیا۔ پس اَمر و نہی کے قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کے علم کے لیے نبوّت رکھی اور یہ نبوّت نوعِ بشری کے ساتھ مخصوص رکھی اور نبوّت کے علم صرف انسان کو دیے۔

دیگر مخلوقات پر انسان کی برتری: یعنی چار ذی شعور مخلوق: ملائکہ، جنّات، حیوانات، انسان میں سے یہ علم صرف انسان کو بخشا۔ باقی تین اقسام: ملائکہ، جنّات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہیں ہوا۔ یا کسی قدر ہوا تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطے سے ہوا۔ سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہم سری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علومِ طبیعیہ، علومِ وہمیہ، علومِ خیالیہ، علومِ عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیّت نہیں، یہ اور انواع کو بھی میسّر ہیں۔ کیوں کہ یہ تمام علوم اپنی اندرونی قویٰ سے اُبھرتے ہیں اور یہ قویٰ جان داروں میں کم و بیش سب میں رکھے گئے ہیں۔ عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبیعت، ہر ایک چیز میں ہے۔ اس لیے ان کے ذریعے جو تصور بھی جان دار کو بندھے گا اس سے خود اس کے نفس کی مرضی نامرضی اور خواہش و طلب کھلے گی۔ خدا کی مرضی نامرضی اور خدا کی مطلوبہ کاموں سے اس کا کوئی تعلّق نہیں۔ کیوں کہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ میں آسکتی ہے اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوّت و رسالت کے ذریعے آتا ہے اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس سے نمایاں ہوگیا کہ انسان کی خصوصیّت علومِ طبیعیہ، علومِ وہمیہ، علومِ خیالیہ، علومِ شیطانیہ نہیں، بلکہ علومِ الٰہیہ ہیں۔ علومِ نبوّت اور علومِ رسالت ہیں۔ جو انسان کے سوا کسی کو میسّر نہیں۔ اس لیے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور فضیلت کا دعویٰ کرسکتا ہے تو

وہ علومِ شرعیہ کے ذریعے کرسکتا ہے، نہ کہ علومِ طبیعیہ وعقلیہ ووہمیہ کے ذریعے کہ یہ علوم انسان کے سوا اوروں کو بھی میسّر ہیں۔

دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہی کہ اس علم سے انسان کی برتری اور فضیلت ہی ثابت ہوتی ہے، بلکہ اس کی انسانیت کا مدار بھی اس علم پر ہے۔ کیوں کہ جب یہ علم ہی انسان کی خصوصیّت ٹھہرا کہ یہ علم نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں، تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس علم سے بہرہ ور نہ ہو۔ کیوں کہ جس چیز کی خصوصیّت ختم ہوجائے جس سے وہ چیز، وہ چیز تھی، تو پھر وہ شئے، وہ شئے ہی نہیں رہتی۔ اگر آپ میں یہ خصوصیّت باقی نہ رہے تو آپ آپ نہیں رہے۔ اگر خصوصیّتِ انسان انسان میں ہو تو انسان انسان کہلائے گا۔ ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ مکان بنانے، کھانے پینے، علاج معالجہ کرنے میں انسان کے برابر ہیں۔

پس جب انسان کی خصوصیّت یہ علمِ الٰہی ہے جس سے وہ مرضیاتِ الٰہی سمجھ لیتا ہے، تو یہ علمِ الٰہی جب انسان میں ہوگا تو اس کا نام انسان ہوگا ورنہ ایک کھاتا پیتا حیوان رہ جائے گا۔ کیوں کہ کھانے پینے پہننے کو کتنا ہی خوش نما بنائے اور علمی رنگ میں نمایاں کرے، تب بھی رہے گا جانور ہی۔ کیوں کہ جانور بھی یہ علوم اپنے اندر رکھتے ہیں، جیسا کہ واضح کیا جاچکا ہے۔

بہرحال یہ بات صاف ہوگئی کہ نہ کھانا انسانیت ہے، نہ پینا، نہ مکان بنانا انسانیت ہے، نہ سیاست وتنظیم۔ اگر کوئی ماہرِفن پچاس منزل کی بلڈنگ بھی بنائے تب بھی وہ اس کی وجہ سے حیوانیت سے نہیں نکل سکتا کہ یہ کام یعنی مکان سازی اس کی خصوصیّت نہیں۔ حیوانیت کی خصوصیّت ہے اور اگر مکان سازی، پارچہ بافی، نظم کاری میں عقل کو بھی لگادیا جس سے یہ اشیا مزیّن ہوگئیں، تو گو بہ ظاہر تو وہ جانوروں سے ممتاز اور افضل ہوگیا، مگر حقیقت میں اُن سے اور زیادہ گھٹ گیا۔ کیوں کہ عقل جیسے پاک جوہر کو اُس نے اپنی طبیعت کا خادم اور غلام بنادیا۔ اور سب جانتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے اور عقل سرچشمۂ شعور ہے۔ تو ایک بے شعور کو باشعور کا حاکم بنا کر گویا جاہل کو بادشاہ اور عالم کو غلام کردیا۔ یہ کہاں کی عقل ہے؟ بلکہ بدعقلی ہے۔ جانور اس بے ہودگی سے بَری ہے۔ اس لیے ایسا کر کے انسان اونچا تو کیا ہوتا جانوروں

سے کہیں زیادی نیچا اور کم رتبہ ہوگیا کہ جانور طبعِ حیوانی کو استعمال کرتے ہوئے عقل کو اس کا غلام تو نہیں بناتے۔ اب خواہ ان میں عقل بالکل نہ ہو یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ انھوں نے طبیعت جیسی جاہل اور بے شعور حاکم کو اس کی جاہلانہ کارروائیوں کو عقل پر حاکم اور غالب نہیں بنایا۔ اور یہ انسان طبعی حرکات کرتا ہے اور عقل سے اُنھیں مزیّن بنا کر ان حیوانی حرکات کو انسانی بلکہ مَلکی حرکات ثابت کرنا چاہتا ہے تو جانور سے زیادہ احمق ثابت ہوا۔

نیز یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ طبعی تقاضوں کو پورا کرلینا کوئی کمال کی بات نہیں، بلکہ طبعی تقاضوں کے خلاف کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، کیوں کہ میں کھانا کھایا کرتا ہوں۔ تو لوگ کہیں گے کہ احمق! یہ کون سے کمال کی بات ہے۔ جانور بھی کھانا کھاتے ہیں، یہ تو طبعی تقاضا ہے۔ اس میں نہ محنت ہے نہ مشقّت اور نہ ہی اس سے انسان کی کوئی جواں مردی اور جفاکشی ظاہر ہوتی ہے، ورنہ سارے جانور بھی فُضلا اور باکمال ہوں گے۔ یا اگر کوئی کہے گا کہ میں بڑا فاضل آدمی ہوں، کیوں کہ میں رات کو پڑ کر سوتا ہوں، تو بھی کہا جائے گا کہ یہ تو ایک غیر اختیاری اور طبعی فعل ہے، جانور بھی کرلیتے ہیں۔ تو اس میں کمال کی بات کیا ہوئی؟

طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے: کمال نام ہے خلافِ طبع کرنے کا کہ اس میں انسان کی محنت، جفاکشی اور تحمّل وصبر کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی کو سنا جائے کہ وہ مہینوں کھانا نہیں کھاتا۔ تو لوگ اُسے باکمال سمجھ کر اس کے پیچھے ہولیتے ہیں کہ واقع میں خلافِ طبع پر قابو پالینا کمال ہے، نہ کہ طبع کا غلام بن کر طبعی تقاضوں کو پورا کرلینا کمال ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حجۃ الاسلام سیّدنا الامام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا بصیرت افروز واقعہ: حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دار العلوم دیوبند جن کا علم وفضل اور کمالِ ظاہری و باطنی معروف ہے، اُن کا زمانہ اور پنڈت دیانند سرسوتی کا زمانہ ایک ہے۔ پنڈت دیانند ہندوؤں

کے فرقہ آریہ سماج کے بانی ہیں۔ انھوں نے قصبہ رڑکی میں اسلام پر اعتراضات کیے، عُلما نے دندان شکن جوابات دیئے اور کہا کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آکر بحث کرو۔ اُس نے کہا کہ تم لوگ میرے مقابلے کے نہیں، میں تو صرف ''مولبی کاسم'' (مولوی قاسم) سے بحث کروں گا۔ چناں چہ رڑکی کے عُلما نے حضرت کو خط لکھا کہ ایسا واقعہ درپیش ہے آپ تشریف لائیں۔ باوجودے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیمار تھے مگر مذہبِ اسلام کی حفاظت واشاعت کی خاطر اپنے چند شاگردوں کے ساتھ رڑکی تشریف لے گئے جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب محدّث دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد حسن صاحب محدّث امروہی، مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہم اور دیوبند کے مشہور ادیب منشی نہال احمد وغیرہ حضرت کے خُدّامِ خاص شریکِ سفر تھے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں کُل ڈیڑھ ذہین ہے: پورے ذہین حکیم مشتاق احمد صاحب اور آدھے ذہین منشی نہال احمد ہیں، ان میں سے جب کوئی میرے وعظ میں سامنے بیٹھ جاتا ہے تو مضامین کی آمد شروع ہوجاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ رڑکی پہنچے تو انھوں نے منشی نہال احمد کو پنڈت دیانند کے پاس بھیجا تاکہ وہ پنڈت جی سے مباحثہ کی شرائط طے کریں۔ جب منشی صاحب پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں، کھانے سے فارغ ہوکر بات چیت کریں گے۔ اتنے میں پنڈت جی کے لیے ایک بڑی لمبی چوڑی پرات (پیتل کی سینی) میں کھانا آیا، جس میں غیر معمولی مقدار میں پوریاں، حلوا اور اسی مقدار میں ترکاری وغیرہ تھی۔ گویا آٹھ دس آدمیوں کی شکم سیری کے بقدر کھانا سینی میں دیکھا گیا جو پنڈت جی کے لیے لایا گیا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ پرات صاف ہوکر باہر آئی جس میں ایک حبّہ بھی باقی نہ تھا۔ منشی صاحب سمجھے کہ پنڈت جی کے ساتھ کھانے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے، کیوں کہ ایک آدمی بھلا اتنا کہاں سے کھا سکتا ہے۔ منشی صاحب کمرے میں اندر گئے تو انھوں نے دیکھا کہ اکیلے پنڈت جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ شاید وہ لوگ دوسرے دروازے سے نکل گئے ہوں گے، مگر دیکھا کہ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ ہی نہیں۔ پھر انھوں نے

خادم سے پوچھا بھی کہ اس کھانے میں کیا اور کوئی بھی پنڈت جی کا شریک تھا؟ اس نے کہا کہ نہیں، صرف پنڈت جی ہی نے کھانا کھایا ہے۔ منشی صاحب حیران رہ گئے کہ یا اللہ! ایک آدمی اور اتنا کھانا؟ بہرحال پنڈت جی سے مباحثہ کے متعلق گفتگو ہوئی اور منشی صاحب نے واپس آکر حضرت نانوتوی سے ساری گفتگو نقل کردی۔

اس سلسلے میں سنانا یہ ہے کہ منشی جی حضرت کے پاس الگ ہوکر جب اپنے ہم جولیوں میں بیٹھے تو منشی صاحب نے کہا کہ بھائی! مجھے ایک بات کی بڑی فکر ہوگئی۔ وہ یہ کہ اگر مسائل میں پنڈت جی سے مناظرہ ہوا تو یقین ہے کہ ہمارے حضرت جیت جائیں گے، کیوں کہ بحمداللہ حق پر ہیں، لیکن فکر یہ ہے کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ پنڈت جی تو پندرہ سیر کھا کے بھی ڈکار نہیں لیں گے اور ہمارے حضرت آدھی چپاتی ہی کھا کر بیٹھ رہیں گے۔ تو بات کیوں کر بنے گی؟ بات ہنسی کی تھی تمام احباب سن کر ہنس پڑے اور بات ختم ہوگئی، لیکن شدہ شدہ یہ بات حضرت تک پہنچ گئی۔ تو منشی جی کو بلایا اور کہا کہ آپ سے کیا کہا تھا؟ منشی جی گھبرائے، فرمایا کہ بات میں سن چکا ہوں، مگر پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں، کیوں کہ مجھے اس کا جواب دینا ہے۔ منشی جی نے ڈرتے ڈرتے اپنا مقولہ دہرایا۔ فرمایا: اس کے دو جواب ہیں: اوّل الزامی جواب ہے اور وہ یہ کہ کیا ساری باتوں کے لیے مناظرے کو میں ہی رہ گیا ہوں۔ آخر تم لوگ کس لیے ساتھ آئے ہو؟ کھانے میں بحث ہوئی تو تم مناظرہ کر لینا۔ دوسرا جواب تحقیقی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت نے ذرا چیں بہ چیں ہوکر فرمایا:) تم اتنے دن صحبت میں رہے تمہارے ذہن میں یہ سوال کیوں کر پیدا ہوا کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہالت میں؟ کھانا بہیمیت کی علامت ہے اور بہیمیت جہالت کا شعبہ ہے۔ تو کیا تم مجھے جہالت اور بہیمیت میں مناظرہ کرانے کے لیے یہاں لائے ہو؟ اگر اس بہیمیت میں مناظرہ ہوا تو ہم بہائم کو مقابلے کے لیے پیش کریں گے۔ ہم پنڈت جی کے مقابلے میں بھینسے کو پیش کریں گے، اونٹ کو پیش کریں گے اور بات بڑھی تو ہاتھی کو پیش کردیں گے کہ کھاؤ کتنا کھاتے ہو۔

پھر فرمایا کہ علم کا شعبہ ہے نہ کھانا، تو تمہارے ذہن میں کیوں یہ سوال نہ پیدا ہوا کہ نہ

کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا۔ کیوں کہ مناظرہ علم کے دائرے کی چیز ہے اور اس میں مناظرہ ہوا تو انسان پیش کیا جائے گا جو ذی علم ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو ہم کہیں گے کہ کھانا کھانے کے بعد ہمیں بھی اور پنڈت جی کو بھی ایک مقفل کوٹھڑی میں بند کردیا جائے اور چھ مہینے کے بعد کھولا جائے جو تروتازہ نکلے، سمجھیے وہی حق پر ہوگا۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا عُروجِ روحانی: اس سلسلے میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ اب مجھے بقائے حیات کے لیے بحمداللہ کھانے پینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اتباعِ سنت کے لیے کھاتا پیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ذکراللہ رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے تو وہی ذریعۂ حیات بن جاتا ہے، جیسا کہ انبیا کی شان ہے کہ وہ اظہارِ عبدیت اور اُمت کے لیے نمونۂ عمل چھوڑنے کے لیے کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی انتہائی قلیل مقدار میں اور وہ بھی بے حدّ سادہ۔ جیسے جَو وغیرہ اور وہ بھی بے شمار فاقوں کے ساتھ۔ اس سے واضح ہوا کہ طبعی تقاضوں کی مخالفت اوران کے ترک کا نام کمال ہے جو جواں مردی ہے۔ طبعی تقاضے پورے کر لینے کا نام کمال نہیں۔ یہ کمال تو ہر جانور میں بھی ہے۔

ایسے ہی فنونِ طبیعیہ میں بڑھ جانے اور ترقی کر جانے کا نام علم اور کمال نہیں کہ یہ طبعی علم بقدرِ بساط حیوانات میں بھی ہیں۔ علمی کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کرکے علم حاصل کیا جائے جو طبیعت کے تقاضوں سے بالاتر ہے وہ علمِ وحی ہے، جو صرف پیغمبروں کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے، نہ کہ نفس میں خیالات پکا کر اُنھیں خوب صورت طریقوں سے نمایاں کردینے سے ملتا ہے وہ صورتِ علم کہلائے گا، حقیقی علم نہیں۔ اور جب یہ علمِ الٰہی ہی انسانی خصوصیّت ہے تو انسانیت کے معنی ہی علمِ الٰہی کے حامل ہونے کے نکلے۔ اس لیے انسان نام جیسے کپڑے پہننے، گھر بنا کر رہنے اور کھانا کھانے کے نہیں۔ ایسے ہی دو کان، دو آنکھ، ایک ناک اور مخصوص صورت زیبا کے نہیں بلکہ سیرت زیبا کے ہیں، جو علمِ لدنی اور علمِ الٰہی سے بنتی

ہے۔ انسان وہ ہے جس سے علم وحکمت کا چشمہ پھوٹے یا اس چشمہ سے سیراب ہو یا اس کا حامی ہو۔ اس لیے حدیثِ نبوی میں ارشاد فرمایا کہ

اَلدُّنیَا مَلعُونَۃٌ مَلعُونٌ مَا فِیھَا إِلَّا عَالِمٌ أَوْ مُتَعَلِّمٌ أَوْ مَا وَالَاہُ.

دنیا بھی ملعون جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون، سوائے عالم کے یا متعلّم کے یا ان کے حامی اور دل دادہ کے۔

اور وہ علم جو عالم یا متعلّم سیکھتا سکھاتا ہو کتاب وسنت کا علم ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

إِنَّمَا الْعِلْمُ آیَۃٌ مُحْکَمَۃٌ، أَوْ سُنَّۃٌ قَائِمَۃٌ، أَوْ فَرِیضَۃٌ عَادِلَۃٌ.

بلاشبہ علم یا محکم آیت (قرآن) ہے یا سنتِ قائمہ ہے یا فریضۂ عادلہ (جو کتاب وسنت کے مشابہ ہو، یعنی قیاس مجتہد)۔

اور یہ علم صرف انبیا سے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ عقل وطبع یا وہم وخیال سے یہ علم آتا ہے۔

علمِ نبوّت کے لیے ضرورتِ جد وجہد: محنت اور خلافِ طبع مجاہدہ اور ریاضت کرنے سے کیوں کہ یہ علم علومِ طبیعیہ وعقلیہ کی طرح طبعی نہیں ہے، اس لیے سب علوم سے افضل ہے، کیوں کہ اُمورِ طبیعیہ کا انسان سے سرزد ہونا عجیب نہیں۔ عجیب یہ ہے کہ اس میں ایک چیز نہ ہو اور وہ آجائے۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سوال فرمایا: أَیُّھُمْ أَعْجَبُ إِیْمَانًا؟ (بتاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے؟) صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت تو وہ تجلّیاتِ ربّانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنّت دوزخ اُن کے سامنے ہے۔ وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ انبیا کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ انبیا علیہم السلام ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن تو ان پر ملائکہ اُترتے ہیں۔ اللہ کی وحی اُن پر آتی ہے۔ جلال وجمالِ خداوندی اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ معجزات اُن کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا

ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمھیں کیا ہوا جو تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبر تمہارے سامنے ہے، معجزات تم بہ چشمِ خود دیکھتے ہو۔ وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اُترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟

تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ (خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے؟) تب حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے، نہ پیغمبر اُن کے سامنے ہوں گے، نہ معجزات اُن کے مشاہدے میں آئیں گے، اور اُوپر سے شکوک وشبہات ڈالنے والے ہزاروں ہوں گے، مگر پھر بھی وہ ایمان لائیں گے، اور اس پر جمیں گے، تو اُن کا ایمان عجیب ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز موانع کی کثرت اور رکاوٹوں کے ہجوم میں حاصل کی جاتی ہے تو وہی زیادہ عجیب ہوتی ہے، ورنہ اگر کسی چیز کے اسباب اور مؤیدات بہ کثرت ہوں، رکاوٹ کوئی نہ ہو، تو اُس کا حاصل کرلیا جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ ملائکہ اگر عبادت میں مصروف ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، کیوں کہ تجلّیاتِ الٰہیہ تو ہمہ وقت سامنے ہیں اور رکاوٹیں بالکل نہیں۔ نہ ان کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا دھندا، نہ شہوت وغضب کا قصّہ۔ تو عبادت اُن کے حق میں اَمرِ طبعی ہے اور طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرلینا کوئی حیرت ناک بات نہیں۔ بلکہ اس سے رک جانا حیرت ناک اور عجیب ہے۔ پس جیسے انسان کے حق میں کھانا پینا، سونا جاگنا عجیب نہیں۔ کیوں کہ طبیعت کا تقاضا ہے۔ ایسے ہی عبادت کرنا فرشتوں کے حق میں طبعی بات ہے جس کو بجا لانا عجیب نہیں۔ عبادت اگر عجیب ہے تو انسان کے حق میں ہے، کیوں کہ وہ اپنی ساری نفسانی خواہشات اور طبعی تقاضوں کو پامال کرکے اور بہ الفاظِ دیگر اپنے نفس کو قتل کرکے رکوع وسجود میں لگتا ہے۔

انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے افضل ہے: انسان کا ایک سجدہ فرشتوں کی ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ عجیب بلکہ افضل ہے۔ کیوں کہ وہ نفس کُشی پر مبنی ہے، نہ کہ نفس کے تقاضوں پر۔ وہ صبح کے وقت گرم لحاف میں سے اُٹھ کر اور خواہشاتِ نفس کے خلاف

سردی میں پانی سے وضو کرکے اور اُوپر سے اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگتا ہے۔ نفس اُسے آمادہ کرتا ہے کہ نرم نرم بستر سے نہ اُٹھے۔ ہاتھ پیر کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے۔ سرد ہواؤں میں سُکڑتا ہوا مسجد کی طرف نہ جائے۔

مگر وہ ان ساری طبعی خواہشات پر لات مار کر محض اپنے مالک کی رضا کے لیے جاتا ہے اور مسجد میں پہنچ کر خداوندِ کریم کے حکم کی تعمیل دل و جان سے کرتا ہے۔ تو یہ مخالفتِ نفس ملائکہ میں کہاں؟ اور یہ نفس کُشی اور جہادِ نفس ملائکہ کو کہاں میسّر؟ کہ وہاں نہ نفس امارہ ہے نہ ہوائے نفس ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جہاد کر کے نفس کو پچھاڑا جائے۔ اس کا مطلب ملائکہ کی توہین نہیں ہے (العیاذ باللہ)۔ وہ اللہ کے مقدّس بندے ہیں ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝﴾[1] وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرماں بردار بندے ہیں جن سے کبھی بھی گناہ و معصیت کا صدور ممکن نہیں۔

﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾[2]

ان کی توہین کفر ہے اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ صرف بیانِ حال ہے کہ ان کی عبادت بلا مزاحمتِ نفس ہے۔

انسان کی عبادت میں مزاحمتِ نفس ہے: اور انسان کی عبادت میں نفس سے پوری مزاحمت ومخالفت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنا کمال نہیں بلکہ خلافِ طبیعت کرنا کمال ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی طبیعت اس کی متحمّل نہیں کہ اس میں علم آئے، بلکہ جہالت اس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ اس کی جبلّت میں جہل ہے، علم نہیں۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے ہنر لے کر نہیں آتا۔ محنت و ریاضت سے ہنر پیدا کرتا ہے۔

طبیعت کو مار کر علم حاصل کرتا ہے جو عجیب بھی ہے اور کمال بھی۔ کمال اس لیے ہے کہ مجاہدے سے اُسے حاصل کیا، جس سے اس کے اندرونی قویٰ کی قوت اور کارگزاری نمایاں ہوتی ہے۔ اور عجیب اس لیے ہے کہ وہ انسان جو ایک گندے قطرے سے بنایا گیا ہے اور جماد لایعقل مادّہ (نطفہ) سے تیار ہوا۔ نہ نور سے بنا، نہ نار سے، بلکہ پامال خاک سے، جس میں

[1] الأنبياء: ٢٦ [2] التحريم: ٦

شعور کا نشان نہیں اور پھر ایسا باشعور نکلا کہ دنیا بھر پر فوقیت لے گیا۔ نوری ملائکہ پر فائق ہوا اور ناری جنّات پر غالب آ گیا، محض علم کے کمال سے۔

انسان کی کائنات سے بازی لے جانے کا سبب: تو علم کا ان گندے مادّوں اور کثیف جسموں میں اُتار لینا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اس عجیب وغریب کمال سے اگر وہ ساری کائنات سے بازی لے جائے تو اس تأمل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

پس ملائکہ میں اگر علم آتا ہے تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے اور ان کا علم اُن کے اندرون سے ہے اور اندرون سے رہتا ہے۔ اس لیے پھیل نہیں سکتا۔ جتنا ہے اُتنا ہی رہے گا، لیکن انسان مجاہدے سے علم حاصل کرتا ہے اور جو چیز اس کے اندر نہیں ہے وہ باہر سے لاتا ہے اور اسے علم حاصل کرنے کے لیے مشقّت و مجاہدے کے ساتھ کتنے ہی راستے تحصیلِ علم کے لیے طے کرنے پڑتے ہیں اور کتنی ہی منزلوں سے گزر کر وہ علم کے مختلف درجات و مراتب اور علمی مقامات تک پہنچتا ہے۔ اس لیے اس کا علم پھیلتا ہے، اس میں تدبّر و تفکّر شامل ہوتا ہے۔ جس سے من بھر علم دس من ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔

ملائکہ کا علم محدود قسم کا علم ہے جس میں پھیلاؤ نہیں اور انسان کا علم تدبّر و تفقہ لیے ہوئے ہوتا ہے جس میں پھیلاؤ ہوتا ہے، یعنی فرشتے کو اگر چار مسئلے معلوم ہیں تو وہ چار کے چار ہی رہیں گے۔ اور انسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ تدبّر و اجتہاد کے ذریعے ان چار میں دس بیس اور مسائل ملا کر نئے نئے علوم نکال لیتا ہے۔ اس لیے ملائکہ نے بہ مقابلۂ آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا:

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ﴾[1]

انسانی علم میں تفقہ و اجتہاد: اور انسان کے استنباط اور اجتہاد کو اس کے خدا نے سراہا کہ

﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى اور جب ان لوگوں کو کسی اَمر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف، تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور

[1] البقرة: ۳۲

﴿الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾[1] اگر یہ لوگ رسول کے اور جن میں ایسے اُمور کو سمجھتے ہیں اُن کے حوالے پر رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں سے اس کی تحقیق کرلیا کرتے ہیں۔

علمی لائن میں انسان کی برتری ملائکہ پر ایک تو کمیّتِ علم کے لحاظ سے ہے کہ اسے تمام اَسما کی تعلیم ملی۔

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾[2]

جو ملائکہ کو نہیں ملی اور دوسرے کیفیتِ علم کے لحاظ سے ہے کہ ملائکہ اپنی معلومات میں تفقّہ و اجتہاد سے کوئی اضافہ نہیں کرسکتے اور انسان کرتا ہے۔ پس اللہ نے انسان کو سب سے زیادہ علم بھی دیا اور اس میں زیادہ علم کی صلاحیتیں بھی رکھ دیں۔

علمی ترقی صرف انسانی خاصہ ہے: پس علم اور ترقیٔ علم درحقیقت انسان ہی کی خصوصیّت ثابت ہوتی ہے جو دوسری مخلوقات میں نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کمالِ علم شاہیت کی شان ہے، کیوں کہ بادشاہ کا کام مزدوری کرنا نہیں بلکہ اپنی ہی مملکت کا علم رکھنا ہے تا کہ احکام دے سکے۔ اس لیے جب انسان کو سب سے زیادہ علم دیا گیا تو قدرتی طور پر نیابت وخلافتِ خداوندی بھی اسی کا کام ہوسکتا تھا جو اسے مل گیا اور اس کائنات کا سارا انتظام اس کے سپرد کردیا گیا کہ وہ نائبِ الٰہی بن کر اس کی کائنات پر حکم چلائے۔ کائنات سے کام لے اور اس میں حسبِ منشا تصرّفات کرے، اس لیے وہ حیوانات سے الگ کام لیتا ہے، جمادات سے الگ بے گار لیتا ہے۔ زمین سے آسمان تک اس کے تصرّفات چلتے ہیں۔ وہ اس مادّی کائنات کے مادّوں میں علم کی طاقت سے جوڑ توڑ کرکے نئی نئی ایجادات کرتا ہے اور اس طرح اپنی علم کی وسعت دیتا رہتا ہے۔ سب سے پہلا علم یہ ہے کہ شئے کا نام معلوم ہو، کیوں کہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر عمل وصنعت میں نئی نئی ایجادات کرنا، نہ فرشتوں سے بن پڑا، نہ جن وحیوان سے، تو حق تعالیٰ کی ازلی عنایت اسی پر متوجہ ہوئی اور اسی کو اُس نے اپنی توجہ وعنایت سے تدریجی طور پر علم سکھلایا۔

[1] النساء: ۸۳ [2] البقرة: ۳۱

چناں چہ علم کا بالکل ابتدائی مرتبہ شئے کا نام معلوم ہونا ہے۔ اگر نام ہی معلوم نہ ہو تو اُس کی طرف توجہ ہی محال ہے کہ مجہولِ مطلق کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے سب سے پہلے شاگرد حضرت آدم علیہ السلام کو اشیا کے نام سکھلائے جو علم کی ابتدائی منزل ہے۔

شئے کا نام معلوم ہو جانے پر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ میں اس کو دیکھ بھی لوں، جس کا نام سنتا آ رہا ہوں۔ تو پھر حق تعالیٰ نے وہ ناموں والی کائنات دکھائی کہ جن اشیا کے نام معلوم ہیں وہ یہ ہیں۔ اور پھر زمین و آسمان اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہیں اُنھیں پیش کیا۔ پھر اُن کے خواص و آثار بتلائے، پھر ان کے نتائج و غایات پر مطلع فرمایا۔ پھر ان سے کام لینا سکھلایا۔ اور پھر ان سے نفع حاصل کرنے کے طریقے سکھلائے۔ غرض درجہ بہ درجہ عالمِ بشریت علمی ترقی کرتا رہا اور انبیا علیہم السلام یکے بعد دیگرے معلّم بن کر آتے رہے اور علم کے مراتب کی درجہ بہ درجہ انسانوں کو تعلیم دیتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انسانی استعداد کامل علم کی مستعمل ہوگئی۔ اور قرن ہا قرن گزرنے اور علمی مشق کرنے کے بعد انسان ہمہ گیر علم کے لیے مستعد ہوگیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر علم اور خلافت کی تکمیل: تو آخری معلّم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا کر بھیجا جنھوں نے حقائقِ الٰہیہ کی تعلیم دی اور دین کو کامل کرتے ہوئے اس کے ہر ہر حکم کی علّت اور مقصد پر مطلع فرمایا، جس سے انسان نے حقیقتِ علم کا سراغ پایا اور وہ قرآنِ حکیم کے جامع علم سے روشن ضمیر بنا۔ پس وہ خلافت جو آدم علیہ السلام کے دور میں اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں وہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ گئی۔ کیوں کہ اس کا منبع علم تھا۔ علم ابتدا میں علم الاسماء کے ابتدائی دور میں تھا تو اس پر موقوف خلافت بھی ابتدائی دور میں رہی اور وہی علم جب ترقی کر کے حدِ کمال پر پہنچ گیا کہ اس کے بعد کسی نبی ہی کے آنے کی گنجایش نہ رہی جو کوئی نیا علم اور نئی شریعت لے کر آئے، تو خلافت بھی حدِ کمال پر پہنچ گئی۔ چناں چہ خلافتِ ظاہری تو حقائقِ کائنات کی تسخیر ہے، جس کے ذریعے عناصرِ اربعہ کے عجائبات نمایاں ہوں اور خلافتِ باطنی حقائقِ الٰہیہ کی تحصیل ہے، جس کے ذریعے روحانیات کے عجائبات نمایاں ہوتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ دورۂ محمدی میں یہ دونوں ہی خلافتیں حدِ کمال کو پہنچ گئیں۔ ایک سے ایک

محیّر العقول مادّی ایجادات انتہا کو پہنچ رہی ہیں جو عقلِ نفس کے کمال کی دلیل ہے اور ایک سے ایک حیرت ناک علمی و روحانی اجتہادات انتہا کو پہنچے جو فقۂ نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ غرض تعقّل اور تفقہ یا عقلِ نفسانی اور فقۂ روحانی دونوں حدِ کمال کو پہنچ گئے، کیوں کہ علمِ جامع دنیا کے سامنے آ گیا، اس لیے خلافتِ ظاہری اور اسمی بھی مکمّل ہوگئی اور خلافتِ حقیقی اور معنوی بھی تکمیل کو پہنچ گئی، لیکن صورت بلاحقیقت ناپائیدار اور بے معنی ہے اس لیے مادّی خلافت بغیر روحانی خلافت کے بے معنی، اور جسم بلا روح کے مانند ہے جس کے لیے نہ بقا ہے نہ پائیداری۔ اس لیے اصل خلافت وہی علمی خلافت کہی جائے گی جس سے انسان کا کامل امتیاز ساری کائنات پر نمایاں ہوگا۔ تاہم یہ دونوں خلافتیں انسان ہی کو دی گئیں۔ نہ ملائکہ کو ملیں، نہ جنّات وحیوانات کو۔ کیوں کہ علم کا یہ مقام اور کسی کو نہیں ملا۔

ہاں! یہ علم انسان ہی میں کیوں ترقی کر سکتا تھا اور کیوں وہ بہائم یا جنّات یا ملائکہ میں ترقی پذیر نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ بھی دونوں قسم کی خلافتوں کے مستحق ہوجاتے۔ سو اس کی بنا یہ ہے کہ علم کی ترقی ہو یا صنعت وعمل کی۔ بغیر تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی نام ہی ٹکراؤ اور تصادم کا ہے۔ اس کے بغیر علم اور قدرت کے مخفی راز آشکارا نہیں ہوسکتے۔

مادّی ترقی کی اصل حقیقت تصادم وٹکراؤ کا نتیجہ ہے: کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ خالی مادّہ میں ترقی نہیں ہوتی جب تک کہ اُسے اُس کے مخالف سے ترکیب دے کر ٹکرایا نہ جائے۔

مثلاً: محض آگ میں کوئی ترقی نہیں ہے۔ جس طرح ہزاروں سال پہلے وہ جلتی اور بھڑکتی تھی، اُسی انداز پر آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہزار دس ہزار برس کے بعد اس کی لپٹ اور رنگ نے ترقی کر کے کوئی نئی صورت یا جدّت پیدا کرلی ہو۔ اس کے کسی انداز میں نہ اضافہ ہے نہ ترقی۔ اسی طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں۔ سمندر کئی ہزار سال پہلے جس طرح ٹھاٹھیں مار کر اُچھل کود کرتا تھا، اُسی طرح آج بھی کر رہا ہے۔ نہ اس کے تموّج نے کوئی جدّت پیدا کی نہ مدّ وجزر نے، وہی تموّج آج بھی ہے جو دس ہزار سال پہلے تھا۔ نیز سمندر بھی وہیں کا

وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ کوئی رُخ تبدیل نہیں کیا۔ نہ اُس کا رُخ بدلا نہ ہی دھارا تبدیل ہوا۔ اسی طرح ہوا جیسے پہلے چل رہی تھی اب بھی اسی انداز سے چل رہی ہے۔ زمین جیسے پہلے ایک تودۂ خاک تھی، اب بھی ہے۔ نہ اس میں کوئی جدّت ہے نہ ندرت ہے، نہ ترقی اور نہ ارتقا ہے۔

لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے ملا کر ٹکرا دو تو وہیں ترقی شروع ہو جائے گی۔ مثلاً: پانی کو ایک برتن میں بھر کر اور بیچ میں ایک پردہ دے کر دوسری جانب آگ دہکا دیں کہ جس سے آگ پانی پر حملہ آور ہو اور پانی آگ پر، یعنی وہ اِسے ٹھنڈا کر دینا چاہے اور یہ اُسے گرما دینا چاہے، تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جائے گی جسے بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں اور اس سے کلیں اور مشینیں چلنے لگیں گی اور تمدّنی ترقی شروع ہو جائے گی۔

اگر آگ کو پانی سے ٹکر نہ دی جاتی تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ تو یہ تمدّنی ترقی دو عنصروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہے جو تنہا تنہا ایک ایک عنصر سے کبھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہوا کو آگ سے ٹکرا دیا جائے اور فضا میں مثلاً آفتاب کی گرمی سے برسنے والی آگ ہوا کے جھکولوں سے متصادم ہوتی ہے تو شہابِ ثاقب اور گرجنے والے رعد و برق پیدا ہوتے ہیں جن سے فضا میں عجائبات نمایاں ہوتے ہیں اور ساکن فضا میں نئے نئے حوادث رونما ہوتے ہیں جو محض آگ یا محض ہوا سے نمایاں نہیں ہوسکتے تھے۔

اسی طرح مثلاً مٹی اور پانی کو ملا دیا جائے کہ مٹی تو پانی کے سیلان اور رقّت کو ختم کر دینا چاہے اور پانی مٹی کے جماؤ کو اور انجماد کو مٹا دینا چاہے، تو ان دونوں کی ٹکر سے گارا پیدا ہو جائے گا اور اس سے اینٹیں بننے لگیں گی جن سے مکانات کی تعمیر ممکن ہوگی۔ پھر اس گارے سے برتن بننے لگیں گے جن سے تمدّن کی ترقی ہوگی اور نئے نئے ڈیزائن کے ظروف و مکان اور سامان کے تیار ہو جائیں گے۔ اگر تنہا مٹی اور پانی اپنی اپنی جگہ پڑے رہیں تو یہ ترقی کبھی بھی رونما نہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ ترقی نام تصادم کا ہے، تصادم نہ ہو تو ترقی بھی نہ ہو۔

ان بے شعور چیزوں کو چھوڑ کر باشعور کو لو تو دو پہلوان مثلاً فنِ کُشتی و سپہ گری کے ماہر ہوں، لیکن کبھی زور آزمائی نہ کریں اور کبھی باہم کُشتی نہ لڑیں تو اُن کے فن اور داؤ پیچ میں کوئی اضافہ نہ ہوگا، لیکن اگر ان دونوں پہلوانوں کو باہم ٹکرا دیا جائے اور وہ کُشتی لڑ پڑیں تو ہر ایک

کوشش کرے گا کہ وہ دوسرے کے داؤ کی کاٹ کرے تاکہ مغلوب نہ ہو، تو ہر وقت نئے سے نیا داؤ اپنے فنی قواعد کے تحت ایجاد کرے گا اور اس طرح فن کے مخفی گوشے کھل کر فن ترقی کرے گا اور دنیا کے سامنے نئے نئے داؤ پیچ کھلتے رہیں گے۔ اگر پہلوانوں کا یہ تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوتا تو فنِ سپہ گری کے راز نہ کھل پاتے۔

علم و جہل اور حق و باطل کے تصادم کی حکمت: تو اسی طرح ایک عالم کتنا ہی بڑا علم رکھتا ہوا اس میں خود بہ خود کوئی اضافہ نہ ہوگا، لیکن اگر اس عالم سے کسی جاہل کو لڑا دو جو اس پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ کر دے تو اس کے علم میں سے نئے نئے گوشے جوابوں کی یہ دولت پیدا ہو جائیں گے جن سے اس کے علم میں زیادتی ہوگی جو بغیر اس علم و جہل کی ٹکر کے کبھی نہ پیدا ہوتی۔

اسلام حق ہے، اس کا علم اور قانون سچّا ہے، لیکن اگر اس کے مقابلے پر کفر نہ ہو اور وہ اس سے ٹکر نہ لیتا ہو تو اسلام کی قوتوں کے مخفی گوشے اور اس کی حقائق کے سربستہ راز جو اس میں پنہاں ہیں کبھی نہ کھل سکتے اور نہ ہی اس کی قوت نمایاں ہو سکتی۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اسلام کے مقابلے پر کفر، اخلاص کے مقابلے پر نفاق، سچ کے مقابلے پر جھوٹ، علم کے مقابلہ پر جہل، دیانت کے مقابلے پر خیانت، ملائکہ کے مقابلے پر شیاطین، انبیا کے مقابلے پر دجال رکھ دیے کہ یہ اضداد ان اصول سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح ان کی پاکیزہ قوتیں اس ٹکراؤ سے نمایاں ہو کر ان کی صداقت کھولتی رہیں۔

قوموں کے مقابلوں میں درسِ عبرت: اسی طرح وہ قومیں کتنی جاہ و جبروت کی حامل ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر دوسری قوموں سے ان کی ٹکر نہ ہو تو ان کے مخفی جوہر جو مقابلے ہی کے وقت کھل سکتے ہیں، کبھی نہ کھلیں۔ اس لیے جب دو قومیں لڑتی ہیں تو غالب و مغلوب کے ملنے سے نئے نئے نظریات اور نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں تاکہ دنیا کی وہ ترقیات جو عقلِ انسانی اور علمِ روحانی سے وابستہ ہیں، اپنے اپنے وقت پر ان تصادموں سے نمایاں ہوتی رہیں اور ہر قوم کے دماغی اور قلبی جوہر کھل کر وہ اگلی نسلوں کے لیے مزید ترقیات کا درسِ عبرت

بنیں۔ ورنہ ہر قوم ماء راکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح سڑ کر اپنے جوہروں کو نہ کھو دے۔ اور اقوام میں اس بے فکری سے سستی، کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جائے اور عالم میں فساد نمایاں ہو جائے۔

اس لیے اقوام کو ٹکرا کر ایک دوسرے کے لیے تازیانۂ عبرت بنا دیا جاتا ہے، تاکہ بے فکری سے اپنی خلقی جوہروں کو ضائع نہ کرنے پائیں۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے اقوام کے تصادم کو خدا کے فضل و کرم سے تعبیر کیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کائنات کے سربستہ راز ہی واشگاف ہو سکتے ہیں، نہ اقوام میں بیداری اور مستعدی ہی پیدا ہو سکتی ہے جو قدرت نے اس میں ودیعت فرما رکھی تھی۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝﴾[1]

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بعضے آدمیوں کو بعضوں کے ذریعے سے دفع کرتے رہا کرتے ہیں، تو سرزمین (تمام تر) فساد سے پُر ہو جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہان والوں پر۔

ٹھیک اس طرح سمجھو کہ انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور کائنات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیت ہے۔ جنّات میں صرف شیطنت ہے اور ملائکہ میں صرف ربانیّت ہے۔ اسی لیے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں۔ کوئی محض آگ کی مانند ہے، جیسے: جنّات۔ کوئی محض ہوا کی مانند ہے، جیسے: ملائکہ۔ کوئی محض پانی یا مٹی کے مانند ہے، جیسے: بہائم۔

سو نہ جنّات میں کوئی ارتقائی شان ہے۔ کسی جن نے نہ آج تک کوئی ایجاد کی جس سے دنیا میں سجاوٹ پیدا ہو جاتی، نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا کہ نیا طریقہ اور نئی شریعت پیدا ہو جاتی، نہ کسی جانور نے آج تک کوئی نیا راستہ نکالا جس سے دنیا کو کوئی راہ نمائی ملتی۔ جنّات و شیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ و فریب اور فساد انگیزی کرتے تھے، اُسی نوعیّت کا آج بھی کرتے ہیں۔ بہائم کھانا پینا، چرنا اور نسل بڑھانا جیسے پہلے کرتے تھے، وہی

[1] البقرة: ٢٥١

آج بھی کرتے ہیں۔ نہ بیل سے گھاس کھانے کا اور نہ نر و مادہ کے ملنے کا کوئی جدید طریقہ نکلا۔ نہ فرشتوں کی نیکی کرنے کا کوئی نیا راستہ نکلا۔ نہ شیاطین کے مکر وفریب میں کوئی جدّت پیدا ہوئی۔ بلکہ ہزاروں سال پہلے ان انواع کے جو طبعی افعال تھے وہی کے وہی آج بھی ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں۔ کیوں کہ یہ سب نوعیں اپنے اندر ایک ہی ایک مادّہ رکھتی ہیں اور ان کے اندرون میں تصادم کی کوئی صورت نہیں، جو ترقی کی بنیاد تھی۔

انسان میں مَلکیّت، بہیمیت، شیطنت، تینوں ہیں: بخلاف انسان کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرما دیں۔ اس میں مَلکیّت بھی ہے، بہیمیت بھی ہے اور شیطنت بھی ہے۔ تو لازمی تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو جو صرف ایک قوّت سے نہیں ہوسکتا تھا۔ مثلاً: بہیمیت کا کھانا پینا اور نسل بڑھانا تھا، لیکن جب اس کے ساتھ مَلکیّت ٹکرا جاتی ہے تو تیسری قوّت پیدا ہو جاتی ہے، جس کو عفت اور پاک دامنی کہا جاتا ہے اور اس سے جائز و ناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز ہے اور فلاں حرام۔ فلاں نسل کُشی حلال اور فلاں حرام۔ فلاں چیز پینی جائز اور فلاں ناجائز۔ غرض تدیّن کے ہزاروں گوشے عفت و پاک دامنی کی بہ دولت کھلتے ہیں۔ جس سے دین و دیانت ترقی کرتے ہیں، اور عفت درحقیقت بہیمیت اور مَلکیّت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے، جیسے آگ اور پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ تھا۔ جس سے تمدّن ترقی کرتا تھا۔ اسی طرح شیطنت کا کام دھوکا، فریب اور دغابازی ہے۔ اس کے ساتھ اگر مَلکیّت کی عقل لڑا دو تو تدبیر و تدبّر پیدا ہوگا۔ جس سے مکر و فریب کے بجائے عقل خیز تدابیر کا ظہور ہوگا اور حملہ آوری اور بچاؤ کے نئے نئے نظریات سامنے آئیں گے۔

درندوں میں قوّتِ غضبیہ ہے جس کا ثمرہ تخریب اور چیر پھاڑ ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی متانت و بُردباری کو ٹکرا دیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوا ہوتی ہے۔ جس میں عقل و ہوش کے ساتھ جوش دکھایا جاتا ہے اور بہادری کے ساتھ دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال شہوت، غضب اور مکر وفریب کے ساتھ اگر قوّتِ عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ

اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور علمی، اخلاقی اور دینی ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں جو صرف انسان ہی سے ممکن ہیں۔ جن و مَلک اور حیوان سے ممکن نہیں۔ کیوں کہ متضاد قوّتوں کا مجموعہ انسان ہی ہے۔ اس لیے ترقی کی راہیں بھی انسان ہی پر کھل سکتی ہیں، نہ کہ ان تین مخلوقات پر۔ اس لیے اگر ایجادات سے دنیا کو سجایا تو انسان نے سجایا۔ ریل، تار، فون، بجلی، اسٹیم، جہاز، کشتی سواری، مکان، ظروف، تجارت، حرفت، حکومت، انسان کے سوا کسی نے کر کے نہیں دکھلائی اور ادھر اجتہادات اور نقل و روایت کا میدان یعنی دین، شریعت، طریقت، مشروب، ذوقِ وجدان، تجربہ، علم، معرفت، قرب، طاعت، بصیرت بھی انسان کے سوا کوئی حتیٰ کہ پاک باز فرشتے بھی میسّر نہ کر سکے۔ یعنی انسان اس ترقی اور ان متضاد مادّوں کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ ارتقا کی یہ دولت فرشتوں سے کہیں زیادہ اونچا پہنچا اور جبرائیل علیہ السلام کی رسائی سے بھی آگے تک اس کی رسائی ہوئی۔ جہاں ملائکہ پَر بھی نہیں مار سکتے۔ یہ اس کے قوّتِ عقلیہ کے قوّتِ شہوانیہ، قوّتِ غضبیہ، قوّت حیوانیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبے کا نتیجہ ہے۔

ہاں! اگر اس ٹکراؤ میں عقل مغلوب ہو جائے اور یہ قوّتیں بہ مقابلہ عقل کے غالب آجائیں یعنی عقل ان مادّوں کی خادم بن جائے اور ان کے تقاضوں کو اپنی تدبیر سے پورا کرنے والی نوکر بن جائے تو پھر یہ بہائم سے چار ہاتھ آگے کا بہیمہ اور شیاطین سے درجوں اُوپر کا شیطان بن جاتا ہے۔ جس سے بہائم اور شیاطین بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اگر اس کی عقل بہیمیت کا آلۂ کار بن جائے تو بہائم کو وہ عیاشی اور بدکاری نہیں سوجھ سکتی جو اسے سُوجھے گی۔ یہ زنا اور سیاہ کاری کی ایسی نئی نئی شکلیں بھی اختیار کرے گا جو بہائم کو ہرگز نہیں سُوجھ سکتیں۔ اس کے یہاں عیاشی کے اڈّے بن جائیں گے، زنا کے چکلے تیار ہو جائیں گے۔ فحاشی ایک فن اور ایک ہنر بن جائے گی اور حیوانات کے خواب میں بھی وہ حیوانیتیں نہ آئیں گی جو اس کا فحاش دماغ اور عیاش دل اختراع کرے گا۔ اور اگر اپنی عقل کو مکر و فریب کی قوّتوں کا غلام بنادیا تو پھر اُسے وہ حیلے اور جعل سازیاں سُوجھیں گی کہ شیطان کو صدیوں غور کر کے بھی نصیب نہ ہوگی۔ غرض ان خِلقی قوّتوں کے ٹکراؤ میں اگر عقل غالب رہی تو یہ اپنی برتری کا ثبوت پیش کرے گا۔ اور اگر عقل پر شہوت و غضب اور درندگی غالب آگئی تو یہی انسان انتہائی پستیوں میں گرا ہوا نظر

آئے گا، لیکن غور کرو تو یہ عقل ان قوتوں پر علم کے ہتھیاروں ہی سے غالب آسکتی ہے۔

بلاعلم کی عقل محض عقلِ طبعی ہے جو بلاشبہ ان ہی طبعی قوتوں کا ساتھ دے گی اور اُنھیں اپنا کام کرنے کے لیے نئے راستے بھی بتلائے گی، لیکن عارف و عالم عقل جسے علم نے چمکا دیا ہو ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی۔

عقل کو ربّانی علوم کا تابع ہونا چاہیے: اور پھر ہر شعبۂ زندگی میں انسانی کمالات کا ظہور ہوگا۔ اس لیے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات پر عقلِ محض سے ثابت نہیں ہوتی، بلکہ علم سے ثابت ہوتی ہے اور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہو اور کورا عقلی بھی نہ ہو، بلکہ ربّانی علم ہو جو بذریعۂ وحی کے ذاتِ حق کی طرف سے آتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے۔ عقلوں کو جِلا دیتا ہے۔ ذہنوں کو رسا کرتا ہے۔ دماغوں کو صیقل کرتا ہے اور بالفاظِ دیگر آدمی کو آدمی بناتا ہے۔ ورنہ: ع

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اس لیے ہمارا فطری اور عقلی فرض ہوجاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الٰہی علم کو حاصل کریں جس سے ہماری روشنی وابستہ ہے اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اسی علم سے ہدایت حاصل کریں۔ یعنی خلوت اور جلوت، انفراد اور اجتماع، دوستی اور دشمنی، حکومت اور غلامی، خوشی اور غمی، راحت اور مصیبت، موت و حیات ہر مرحلے پر اسی علم سے جس کا دوسرا نام شریعت ہے، راہ نمائی حاصل کریں اور اپنی عقل کو اس کے خادم کی حیثیت سے ساتھ رکھیں۔ یہی قوتیں جو جہالت کے ساتھ عیاشی، فحاشی، بدکاری اور بے ایمانی پر لاتی تھی اب شریعت کے تابع ہو کر عفت، عصمت، پاکی، پاک دامنی اور نیکو کاری پر لے آئے گی۔ وہی قوّتِ شیطنت جو بہ حالتِ جہل مکاری، ڈپلومیسی، عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھی، اب تابعِ فرمانِ الٰہی ہو کر تدبیر، دانائی، دانش و بینش اور عاقبت شناسی کی طرف لے آئے گی اور بہ الفاظِ دیگر نفس پرستی سے نکال کر فطرتِ روحانی اور خدا ترسی کی طرف نکال لائے گی۔ اس لیے خلاصہ یہ ہوا کہ طبیعت پر تو حکومت عقل کی قائم کردی جائے اور عقل پر حکمرانی شریعت اور علم

الٰہی کی قائم کردی تو انسان مُزکّٰی، مصفّا اور مجلّٰی ہو جائے گا۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونے کے معنی: ورنہ ایک حیوان یا ایک شیطان یا ایک درندے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ شریعت انسان کے کسی خِلقی مادّے کو ضائع یا پامال کرنے کے لیے نہیں آئی، بلکہ ٹھکانے لگانے کے لیے آئی ہے، تاکہ ہر قوت کو اس کا صحیح مصرف بتلا کر اس میں استعمال کرائے۔ یہی معنی ہیں اسلام کے دینِ فطرت ہونے کے کہ اُس نے ہر قوّت کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب، درندگی ہو یا شیطنت، کسی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا ہے، بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلا دیا ہے۔ نیکی تو بجائے خود ہے، اس نے تو کسی بدی کو بھی بالکل نہیں مٹایا بلکہ اپنے اشاروں پر چلایا ہے۔ مثلاً: جھوٹ گناہِ کبیرہ ہے۔ انسان کی جبلّت میں جوش کے وقت مبالغہ آمیزی اور خلافِ واقعہ کلام کر جانا داخل ہے۔ شریعت نے اسے کلیتاً نہیں مٹایا، بلکہ فرمایا کہ اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بول کر بھی صلح کرا دو تو نہ صرف کہ یہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ملے گا اور ایسا اجر جو نماز روزے پر ملتا ہے۔

دو بھائی باہم لڑ رہے تھے، آپ نے ایک بھائی کے پاس جا کر کہہ دیا کہ تم کس کا مقابلہ کر رہے ہو، وہ تو تمہاری جدائی سے بے حدّ غمگین اور سوگوار ہے اور رات تو وہ آپ کی تعریف میں رطب اللّسان تھا اور روتا تھا کہ ہائے! میرا بھائی مجھ سے جدا ہوگیا۔ اُدھر دوسرے بھائی کے پاس گئے اور اس سے بھی ایسی ہی باتیں کہیں جس سے دونوں کے دل نرم ہو گئے اور مصالحت کو آمادہ ہوئے اور صبح کو دونوں نے معانقہ کر کے باہم صلح وصفائی کر لی، تو اِس جھوٹ پر ثواب اس سچ کی نسبت یقیناً ملے گا جس سے فتنے کا بیج بو دیا جائے اور دو ملے ہوئے بھائیوں کو لڑا دیا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کو بھی شریعت نے مٹایا نہیں، بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے اشاروں پر چلایا ہے۔ گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے اگر شریعت کے اشاروں سے ہو۔ اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت بن جاتا ہے۔ غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی واقعی عیب کو اس کے پسِ پشت بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ شریعت نے اس سچ کی ممانعت فرمائی اور اسے حرام رکھا۔ حالاں کہ غیبت سچّی بات کو کہتے

ہیں، اور جھوٹ ہو تو وہ افترا ہوگا غیبت نہ ہوگی۔ تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡهِ مَیۡتًا فَکَرِهۡتُمُوۡهُ﴾[1] کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو۔

یعنی غیبت کرنا ایسا گندہ فعل ہے جیسے اپنے بھائی کا مردار گوشت نوچ نوچ کر کھانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے نہ اور نہ جھوٹ معصیت۔ بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے اور نہ ماننا معصیت ہے۔ نماز عبادت ہے مگر پانچ وقت میں فرض ہے۔ اُنھیں ترک کردو تو معصیت ہے، لیکن یہی نماز تین اوقات میں حرام ہے: سورج طلوع ہوتے وقت، غروب ہوتے وقت اور استوا یعنی سورج کے سر پر ہوتے وقت۔ ان اوقات میں اگر نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا۔ معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے، بلکہ کہنا ماننا ہی عبادت ہے۔ ماہِ رمضان میں روزہ فرض ہے۔ اگر بلا عذر ترک کیا جائے تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں، لیکن یہی روزہ عید کے دن حرام ہے۔ اگر روزہ رکھ لے گا تو گناہ گار ہو جائے گا۔ جس سے واضح ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے، کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم کہیں روزہ رکھو، جب ترک کرائیں ترک کردو۔ اپنی تجویز کو دخل مت دو کہ یہی اطاعت درحقیقت عبادت ہے۔ یہ نماز روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں۔ حقیقتِ عبادت اطاعت اور تسلیم و رضا ہے۔

خود کشی حرام اور بہت بڑا جرم اور گناہ ہے۔ مگر جہاد میں اپنے کو قتل کے لیے پیش کردینا اور سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اس سے واضح ہے کہ نہ جان دینا عبادت ہے نہ جان بچانا عبادت ہے۔ کہنا ماننا اور بروقت تعمیلِ حکم کرنا عبادت ہے۔ یہی قتل اپنے نفس کے لیے کیا جائے تو معصیت کہ خلافِ اطاعت ہے اور یہی قتلِ نفس اگر حفاظتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر کیا جائے تو شہادت اور عینِ دین و عبادت ہے، کیوں کہ یہ نفس اور بدن آپ کی ملکیّت نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے۔ اس کو آپ اپنی مرضی سے ضائع نہیں کرسکتے۔ ہاں! مالک کے حکم پر رکھ بھی سکتے ہیں اور کھو بھی سکتے ہیں۔ وہ رکھوائے تو اس کا رکھنا اور بچانا عبادت

[1] الحجرات: ۱۲

ہے۔ وہ خود ہی اسے تلف کرالیں تو تلف کر دینا ہی عبادت ہے۔ لوٹ مار اور غارت گری معصیت ہے نہ اس سے بچنا عبادت ہے اور نہ کرنا معصیت ہے، اگر کہے کے مطابق لوٹ مار بھی ہو تو عبادت ہے اور کہے کے خلاف امن و امان دینا بھی معصیت ہے۔ زمین پر اکڑ کر سینہ تان کر اور مونڈھے ہلا کر چلنا تکبّر ہے۔ جس کو قرآن نے حرام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ

﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ج اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا٥﴾[1]

خدا کی زمین پر تکبّر کی چال مت چلو، کیوں کہ تم اکڑ کر اور اُبھر اُبھر کر زمین کو چیر نہیں دو گے اونچے ہو کر طول میں آسمان تک نہیں پہنچ جاؤ گے۔

پھر کیوں یہ اینٹھ کر چلنے کی مصیبت بھر رہے ہو، جس سے صاف واضح ہے کہ اینٹھ مروڑ کے ساتھ چلنا معصیت اور جرم ہے، لیکن حج کے موقع پر جس طواف کے بعد سعیٔ صفا مروہ ہو اُس میں ابتدا کے تین پھیروں میں اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجب اور جزوِ عبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ اکڑ کر چلنا معصیت ہے نہ جھک کر چلنا عبادت ہے، بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے۔ پس اصل چیز اطاعتِ حق نکلی۔ اگر اطاعت کے خلاف ہے تو نماز روزہ بھی معصیت بن جاتے ہیں اور اگر کہے کہ مطابق ہے تو جھوٹ، لوٹ مار، تکبّر کی چال اور غارت گری بھی عبادت بن جاتی ہے۔ پس اس طرح تمام خِلقی قوتوں کو شریعت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ سب اطاعت بنتے جائیں گے اور خلافِ حکم استعمال کیا جائے تو معصیت ہوتی چلی جائیں گی۔ اس سے عبادت کی دو قسمیں نکلتی ہیں: ایک افعالِ خیر جن کا کیا جانا ضروری ہے اور ایک افعالِ شرّ جن سے بچایا جانا ضروری ہے۔

بِرّ و تقویٰ: پہلی قسم کو شریعت کی اصطلاح میں بِرّ کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا:

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾[2]

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو، لیکن اصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے۔

[1] بنی اسرائیل: ۳۷ [2] البقرة: ۱۷۷

اور دوسری نوع کو تقویٰ کہتے ہیں جس کے ذریعے گناہ سے بچا جاتا ہے۔ عبادت کی ان دونوں نوعوں کو پیشِ نظر رکھ کر غور کرو تو انسان ملائکہ سے علم ہی میں بڑھا ہوا نہیں ہے بلکہ عبادت میں بھی فائق ہے۔ کیوں کہ تقویٰ کی عبادت ملائکہ میں ہے ہی نہیں۔ کیوں کہ تقویٰ کہتے ہیں شرّ سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شرّ کا مادّہ ہی نہیں، وہ شرّ کے افعال کر ہی نہیں سکتے، تو ان سے بچنے کے لیے کہا بھی نہیں جا سکتا اور انسان شرّ کر بھی سکتا ہے اور اس سے بچ بھی سکتا ہے۔ اس لیے شرّ سے اُسے ہی روکا بھی جا سکتا ہے اور اس کا رکنا عبادت بھی قرار پا سکتا ہے اور فرشتے میں نہ شرّ کا مادّہ ہے نہ اس کے شرّ سے بالا رادہ رکنے کا ہی سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لیے تقویٰ کی نوع کی عبادت ہی فرشتے کے لیے نہیں بلکہ یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے، تو انسان اس نوعِ عبادت میں ملائکہ سے بڑھ گیا۔ اب جو عبادتیں کرنے کی ہیں ان میں معاشرت، معاملات اور خانگی زندگی کی عبادت بھی فرشتوں کے لیے نہیں، کیوں کہ ان میں نسل کا قصّہ ہی نہیں کہ ان کے عزیز و اَقربا پیدا ہوں اور معاملات و لین دین، آشتی و صلح اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے۔ اس لیے بِرّ کی دو تہائی حصّہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص نکلے۔

اب رہے اعتقادات، سو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیوں کہ اعتقاد کی اصل ایمان ہے اور ایمان کے معنی ایمان بالغیب کے ہیں اور فرشتے کے حق میں وہ چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے، غیب ہی نہیں کہ اسے ایمان کا مکلّف قرار دیا جائے اور ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لیے اعتقادات کا حصّہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔

اب اگر رہ جاتا ہے تو دیانات کا باب رہ جاتا ہے۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ۔ سو ان کی ضرورت معاشرت کے لیے ہے۔ فرشتوں میں معاشرت ہی نہیں، کیوں کہ نسل نہیں۔ اس لیے مال کے لین دین کا بھی سوال نہیں ہوسکتا۔ تو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہی۔ رہا روزہ کے معنی اپنے ارادہ و نیت سے کھانا پینا اور لذّتِ نساء کو ترک کرنا ہے۔ فرشتے کے لیے نہ بیوی ہے، نہ کھانا پینا، تو وہاں اس عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس لیے لے دے کر نماز رہ جاتی ہے۔ تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ فرشتے کی طبعی بات ہے اور طبعی تقاضوں سے

کسی کام کا کرنا عجیب نہیں۔ اس لیے انسان کا ایک سجدہ جو خلافِ طبع کو برداشت کر کے ہوتا ہے فرشتے کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیانات وعبادات میں بھی انسان ہی فرشتے سے افضل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں یہ بہیمیت اور شیطنت والی قوّتیں ہی ہیں جن کی بہ دولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ فرشتے میں یہ دونوں قوّتیں نہیں۔ اس لیے وہ دوتہائی دین سے الگ تھلگ ہے۔ اب انسان میں قوّتِ عقلی ہے جو فرشتے میں بھی ہے، مگر اس عقل کے کتنے ہی مصرف جس سے عقلی قوّت کی تفصیلات کھلتی ہیں صرف انسان میں ہیں، ملائکہ میں نہیں۔ اس لیے وہ طاعت اور عبادت میں بھی وہ انواع پیش نہیں کرسکتا جو انسان پیش کرسکتا ہے۔ غرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند ہیں اور انسان پر کھلے ہوئے ہیں۔ اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانونِ الٰہی کے ماتحت گزارنا ہے۔ سو جو جامع زندگی انسان کو ملی ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملی۔ اس لیے تمام اور تسلیم ورضا اس کی زندگی میں ممکن ہوسکتا ہے، کسی دوسری نوع کے لیے ممکن نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ہوا:

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ﴾[1] اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ۔

تو یہ مطلب نہ تھا کہ معاذ اللہ! کفر سے اسلام میں داخل ہو، بلکہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور گردن جھکا دو، تو عرض کیا کہ

﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾[2] میں مسلم بن گیا۔

ارشاد ہوا کہ اعلان کردو کہ

﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۝﴾[3]

میری نماز اور عبادت اور میری زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم کیا گیا ہے اور میں اوّل مسلمین میں سے ہوں۔

پس اسی سپردگی وتسلیم کو اسلام کہتے ہیں کہ رضائے حق کے لیے جیئے اور رضائے حق ہی کے لیے مرے۔ اسی کی خوش نودی کے لیے صلح کرے۔ اُسی کے لیے لڑے۔ اُسی کے لیے

---

[1]، [2] البقرۃ: ۱۳۱ [3] الأنعام: ۱۶۲، ۱۶۳

محبّت کرے۔ اُسی کے لیے عداوت باندھے۔ اُسی کے لیے دے اور اُسی کے لیے ہاتھ روکے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

مَنْ أَحَبَّ فِي اللّٰهِ وَأَبْغَضَ فِي اللّٰهِ وَأَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ، فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ.

جو اللہ ہی کے لیے محبّت کرے، اُسی کے لیے عداوت کرے، اُسی کے لیے دے اور اُسی کے لیے ہاتھ روک لے، تو اس نے ایمان کامل کرلیا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ افعال فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں نہ شہوت ہے نہ شیطنت، نہ غفلت ہے نہ نخوت۔ اس لیے جو اطاعت انسان کرسکتا ہے وہ فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں وہ مادّے ہی نہیں جن کی روک تھام سے عبادت کی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔ اس لیے فرشتے کو ان علوم کی وہ ضرورت بھی نہ تھی جو انسان کو تھی۔ کیوں کہ جتنی مادّی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں اتنے ہی دفاع و مدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لیے ضروری تھا۔

انسان کا علم فرشتوں سے کامل ہے: اس سے واضح ہوا کہ انسان کا علم بھی فرشتوں کی نسبت کامل اور جامع ہے اور اس کی عبادت بھی ان کی نسبت کامل اور جامع ہے اور بوجہ مدافعت جتنی عبادت انسان کی مضبوط ہے، فرشتے کی نہیں ہوسکتی۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم بھی اس کا کامل اور عبادت بھی اس کی مکمّل تو ساری کائنات میں سے صرف یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائبِ خداوندی بنے۔ کیوں کہ کمالاتِ خداوندی لامحدود ہونے کے باوجود وہی نوعوں میں اصولاً منحصر ہیں۔ کمالاتِ علم اور کمالاتِ عمل اور ان ہی دو میں یہ انسان ساری مخلوقات حتیٰ کہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر نکلا تو خدا کا نائب بھی ان کمالات میں یہی ہوسکتا تھا۔ اور عمل چوں کہ علم کے تابع ہے اس لیے اصل بنیادِ خلافت علم ہی ٹھہرتا ہے، جو انسان ہی میں حدِّ کمال تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لیے اسی کو خلیفۂ الٰہی بنایا گیا۔

خلافتِ انسانی کے بارے میں ملائکہ کا سوال: اسی لیے جب فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں کیوں نہ خلیفہ بنادیا جائے کہ ہم سے زیادہ آپ کی تقدیس وتسبیح کرنے والا اور کون ہے؟ تو حق تعالیٰ نے اوّلاً حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملے کو ہم جانتے

ہیں تم نہیں جانتے۔ جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا کہ آدم علیہ السلام کو اَسما کی تعلیم دے کر ملائکہ کو چیلنج کیا کہ ذرا تم اشیائے کائنات کے نام تو بتاؤ؟ وہ نہ بتا سکے تو آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم بتاؤ؟ انھوں نے تمام نام گنا دیے۔ تو بتلا دیا گیا کہ علم کا ابتدائی مرحلہ علمِ اَسما ہے۔ جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لے جا سکے تو اَسما کے بعد صفاتِ اشیا، پھر خواصِ اشیا، پھر حقائقِ اشیا وغیرہ کے علوم میں تم ان سے کب بازی لے جا سکو گے۔ اسی لیے مستحقِ خلافت انسان ہی ہے۔ رہا عملی میدان، تو اس میں ملائکہ نے نوعِ انسانی کی مذمت کی تھی کہ وہ خون ریز ہوگا، مفسد ہوگا۔ تو قدم قدم پر حق تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے اعمال اوّل تو ملائکہ ہی سے لکھواتے ہیں۔

بارگاہِ الٰہی سے قولی و عملی جواب: تاکہ قیامت تک اُن کے اس شبہ کا عملی جواب ہوتا رہے اور وہ انسان کی نیکی پر گواہ بنتے رہیں اور ساتھ ہی حدیث میں آیا ہے کہ جب کہیں مجلسِ وعظ و نصیحت وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے اس مجلس پر نازل ہوتے ہیں جو اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جب یہ مجلسِ خیر ختم ہوتی ہے تو وہ فرشتے آسمانوں میں چڑھتے ہیں اور اُنھیں حق تعالیٰ سے قرب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: تم کہاں گئے تھے؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کے بندوں کی مجلس میں۔ فرماتے ہیں: تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد میں مصروف تھے۔ آپ کی جنّت کے طالب تھے اور جہنّم سے خائف تھے۔ فرماتے ہیں: کیا انھوں نے جنّت و دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں: دیکھا تو نہیں، انبیا سے سن کر ایمان لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر جنّت و نار دیکھ لیں تو کیا کریں؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ پائیں تو سوائے جنّت مانگنے اور دوزخ سے پناہ مانگنے کے اُنھیں کوئی کام ہی نہ رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے ان سب کو بخش دیا جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بخشنا تھا تو ان اربوں کھربوں فرشتوں کے نازل فرمانے اور اُنھیں آسمان پر چڑھا کر ان سے پوچھنے اور اُنھیں گواہ بنا کر مغفرت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے بغیر بھی مغفرت فرما سکتے تھے۔ پھر یہ کہ ایسی مجلسیں

دنیا میں نہ معلوم کتنی ہوتی ہیں اور ہر جگہ ملائکہ کا ان مجلسوں پر اُترنا اور پھر چڑھنا اور پھر گواہ بننا آخر کیا ضروری تھا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ملائکہ کو عملی جواب دینے کے لیے ہے کہ جس بارے میں تم کہتے تھے کہ

﴿اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾[1] کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خون ریزیاں کریں گے۔

تم نے دیکھا کہ وہ کس طرح عملِ صالح اور بِرّ و تقویٰ میں لگا ہوا ہے اور کس درجہ صالح بن کر دین کو پھیلانے اور اس پر جمے رہنے کی سعی کر رہا ہے۔

انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت: کیا یہ فساد ہے؟ کیا یہ خون ریزی ہے؟ پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت و طاعت میں اسے فرشتوں سے اونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اس کی نیکی پر گواہ بنایا، تاکہ اس کی سفا کی اور فساد کا تخیّل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بہ صدقِ دل اس کی خلافت کے معترف ہوجائیں۔ چناں چہ ہر غیر معمولی عمل و عبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج و زیارت کرتے اور طواف و سعی میں دوڑتے ہیں۔ منٰی و عرفات میں ٹھہرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے منہ موڑ کر، سر سے کفن باندھ کر اپنی لذّت و آرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ صرف میری خوش نودی اور رضا کے لیے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ! تم گواہ رہو کہ میں نے ان کو بخش دیا۔ حقیقت میں یہ فرشتوں کو وہی عملی جواب ہے کہ وہ انسان جس کے متعلق تم نے ﴿اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا﴾ کہا تھا۔ دیکھو! کیا طاعت و عبادت اور ترکِ لذّات میں اپنے رب کی خاطر مصروف ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ دن کے اعمال لکھنے والے ملائکہ الگ ہیں اور رات کے الگ۔ دن والے فرشتے عصر کی نماز کے وقت اُوپر چڑھتے ہیں اور اعمال

[1] البقرۃ: ۳۰

نامے رات والے ملائکہ کے حوالے کر دیتے ہیں اور رات والے فرشتے صبح کی نماز کے وقت دن والوں کو چارج دے کر اُوپر چڑھتے ہیں۔ غرض دونوں وقتوں کے ملائکہ کا عروج ونزول فجر وعصر کی نمازوں کے وقت کرلیا گیا۔ ان کے چڑھنے پر حق تعالیٰ جب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا؟ تو جواب میں عرض کرتے ہیں کہ

تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ، وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ. جب ہم نے اُنھیں چھوڑا جب بھی نماز میں مصروف تھے اور جب ہم نے جاکر دیکھا جب بھی نماز ہی میں مشغول تھے۔

سو یہ وہی عملی جواب ہے کہ جن کے بارے میں تم مُفسد اور سفاک ہونے کے مدعی تھے۔ دیکھو! وہ رات دن کیسا مصروفِ عبادت ہے۔ یہ معاملہ روزانہ صبح اور شام ہوتا رہتا ہے۔ گویا صبح شام ملائکہ کو عملی جواب دے کر انسان کی برتری اُن پر جتائی جاتی ہے، تاکہ روزانہ ان کو عملی جواب ملتا رہے اور وہ انسان کی فضیلت اور اس کی خلافت کے معترف ہوتے رہیں۔ پھر نہ صرف علم وعمل ہی انسان کا فرشتوں سے بالا و برتر ہے بلکہ احوال و کیفیات بھی دیکھی جائیں جو قربِ الٰہی سے اُسے حاصل ہوتی ہیں، سو وہ بھی احوالِ ملائکہ سے بالا و برتر ہیں۔ آخر جو احوال کیفیات انبیا اور اولیاء اللہ پر طاری ہوتی ہیں، وہ فرشتوں پر نہیں آسکتیں۔ کیوں کہ نہ ملائکہ علم وعمل کے ان میدانوں سے گزرتے ہیں جس سے انسان گزرتا ہے، نہ ان پر وہ کیفیات عشق ومحبّت طاری ہوتی ہیں جو انسان پر ہوتی ہیں اور جب علم، عمل، حال، سب ہی میں انسان ملائکہ سے فائق ہے تو انسان ہی کا حق تھا کہ اُسے نیابت کی نعمت سے نوازا جائے اور اپنا نائب بنایا جائے کہ بنائے خلافت یہی دو چیزیں تھیں۔ یعنی علمِ خداوندی اور اخلاقِ خداوندی۔ وہ دونوں جب اس میں علی وجہ الاتم ثابت ہوتے ہیں تو خلافت بھی علی وجہ الاتم اس میں آسکتی تھی۔

تکمیلِ خلافت کا مقام: البتہ یہ ضرور ہے کہ تکمیلِ خلافت دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں ہوگی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بنائے خلافت جب کہ علم کامل اور عمل کامل ہے تو یہ علم وعمل جب

تک کہ اسی انداز کا نہ ہوگا جس انداز کا خود حق تعالیٰ کا ہے اس وقت تک اس انسان کو علمی و عملی خلافت کی تکمیل نہیں ہوسکتی، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے علم اور عمل کی شان یہ ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا علم بھی اسباب سے بے نیاز ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے کوئی کتاب پڑھ کر یہ علم حاصل کرلیا (معاذ اللہ)۔ بلکہ علم کا سرچشمہ خود اس کی ذات ہے۔ یعنی علم خود اس کی ذات بابرکات سے اُبھرتا ہے۔ ایسے ہی اس کی صناعی بھی وسائل و آلات کی محتاج نہیں۔ بلکہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو فرمادیتے ہیں: کن (ہوجا) فیکون، تو وہ ہوجاتی ہے۔ اس لیے وہ پل بھر میں جہان بنادیتے ہیں اور ان کے ارادے ہی سے وہ چیز خود بہ خود معرضِ وجود میں آجاتی ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾[1] بلاشبہ ان کا معاملہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کیا تو کہہ دیتا ہے کہ ہوجا، پس وہ ہوجاتی ہے۔

اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیت اس میں جنّت میں داخل ہوکر پیدا ہوگی۔ چناں چہ علم تو یہ ہوگا۔ یعنی ماضی و مستقبل سب کچھ انسان پر روشن ہوکر اس کے علم میں آجائے گی۔ اگلے پچھلے تمام کیے ہوئے اعمال اس کے سامنے آجائیں گے اور یہ علوم اسے خود بہ خود حاصل ہوں گے۔ نہ کوئی اُستاد ہوگا نہ کتاب، بلکہ نفسِ انسانی خود مُدرک بن جائے گا۔ فرمایا گیا:

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ۝﴾[2] تو اس وقت ہر شخص ان اعمال کو جان لے گا جو لے کر آیا ہے۔

اور ہر عمل کی یہ کیفیت ہوگی کہ تمام صنعتیں اس کی قوتِ متخیّلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب و محنت اور اختیارِ اسباب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جس چیز کی خواہش ہوگی ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی۔ اسی کو قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۝﴾[3] اور تمہارے لیے اس جنّت میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لیے اس

[1] یٰس: ۸۲ [2] التکویر: ١٤ [3] حم السجدة: ٣١

میں جو مانگو گے موجود ہے۔

گویا کن فیکون کی طاقت پیدا ہوجائے گی کہ جو چاہا وہی ہوگیا۔ نہ اسباب کی ضرورت، نہ وسائل کی۔ اور جب علمِ انسانی اسباب سے مستغنی ہوجائے گا اور عمل، کسب و ریاضت سے مستغنی ہوکر محض قوتِ ارادہ کے تابع ہوجائے گا، بہ الفاظِ دیگر حق تعالیٰ کے علم وصفت کے مشابہ ہوجائے گا تو اس وقت انسان کی علمی وعملی خلافت مکمّل ہوگی کہ وہ جس کا نائب ہے وہ علم وعمل میں کامل ہے اور اس نائبِ الٰہی کا علم وعمل اس کے علم وعمل کے مشابہ ہوجائے گا اور جب کہ بنائے خلافت بھی علم وعمل ہی تھا جو اب علم وعملِ خداوندی کے مشابہ بن گیا، تو خلافت بھی صحیح معنی میں اسی وقت مستحکم ومضبوط ہوگی۔ مگر جنّت میں یہ استحکامِ خلافت جب ہی ہوگا جب دنیا میں علم وعمل کے اسباب و وسائل اختیار کرکے اُسے جزوِ نفس بنانے کی انسان نے سعی کی ہوگی، ورنہ یہاں کی محرومی سے وہاں بھی محرومی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ کامل بن جانے کے بعد حق تعالیٰ ان بندوں کو ان ہی القاب وخطابات سے یاد فرمائیں گے جو القاب وخطاب خود ان کے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو نشاط میں لانے کے لیے ان کے نام خطوط بھیجیں گے۔ فرشتے خطوط رسانی کا کام کریں گے۔ ان خطوط کے لفافوں پر پتا یہ لکھا ہوگا:

مِنَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ إِلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ. عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز ورحیم کو پہنچے۔

یعنی القاب بھی وہی دے دیں گے جو خود ان کے سرکاری خطابات ہیں۔ بس اسی عالم میں انسان صورتاً خلیفۂ خداوندی ہے اور محض خلافت کے راستے پر پڑتا ہے۔ آخرت میں پہنچ کر حقیقی معنی میں خلیفۂ خداوندی بن جائے گا، مگر یہ منزل جب ہی آئے گی جب اس کا راستہ دنیا میں اختیار کرلیا جائے گا۔ اگر یہاں نیابت کی یہ ظاہری صورت اختیار نہ کی جائے جو طاعت وعبادت سے بنتی ہے تو وہاں تکمیل کس چیز کی ہوجائے گی اور کیسے ہوجائے گی۔ بہرحال یہ واضح ہوگیا کہ جنّات، ملائکہ اور حیوانات مین سے اس خلافت کے عہدے کے لیے کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا، آیا تو صرف انسان کا آیا ع

قرعۂ فال بہ نامِ منِ دیوانہ زدند

سو ان میں سے حیوانات تو قابلِ خطاب ہی نہ تھے۔ اس لیے قابلِ ذکر بھی نہ تھے۔ قابلِ ذکر ملائکہ، جنّات اور انسان ہی تھے۔ سو ان ہی کا اللہ نے اس آیت میں ذکر فرما کر ہر ایک کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملائکہ کا ذکر فرما کر ان کی علمی کم مائیگی پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ علم کے میدانِ مقابلہ میں انسان سے ہار گئے۔ شیطان کا ذکر فرما کر جو جنّات میں سے ہے، اس کے فہم و عمل کی کوتاہی پر روشنی ڈالی کہ وہ اَمرِ خداوندی کے معارضے پر اُتر آیا اور سرکشی پر آمادہ ہوگیا جو اُس کی بدفہمی اور بدنیتی تھی۔ پس نہ کم علم خلیفۂ الٰہی بن سکتا تھا نہ بدفہم اور بدنیت۔ انسان نے علم کا بھی ثبوت دیا کہ اشیا کے نام سیکھ لیے اور تعمیلِ ارشاد کا بھی ثبوت دیا کہ جنّت کی سکونت کا حکم دیا گیا تو وہاں جا داخل ہوا اور علمِ اَسما سے اس کا علم ترقی کر گیا جس سے زندگی اس کی جامع ہوئی اور ان ناموں کے ذریعے اس نے تمام اشیائے زندگی پر قابو پالیا اور کائنات اس کے لیے مسخّر ہوگئی۔ ملائکہ اس کی خدمت پر لگا دیے گئے اور شیطان کو مردود بنا کر اس کے مقابلے پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ چوکنّا رہے اور اس کا مقابلہ کر کے اپنی مخفی علمی اور عملی قوتوں کا ثبوت دے اور اسی طرح اس کی خلافت روز افزوں چمکتی رہے۔ یہ علم انبیا کو دیا اور انبیا نے یہ علم جو مبنائے خلافت ہے بنی نوعِ انسان کو سکھایا۔ پس انبیا علیہم السلام حق تعالیٰ کے تو شاگرد ہیں اور کائنات کے اُستاذ اور مربّی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان پاک باز اُستادوں کا گروہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد میں بھیجا اور دنیا کو حکم دیا کہ ان سے علم سیکھے اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ پس یوں سمجھو کہ یہ پوری دنیا ایک مدرسہ ہے جس کا فرش زمین ہے۔ چھت آسمان ہے۔ اس میں چاند، سورج اور ستاروں سے چاندنا کیا۔ انسان و جنّات اس مدرسے کے طلبہ ہیں۔ انبیا علیہم السلام اُستاد ہیں اور ملائکہ خُدّامِ مدرسہ ہیں۔ نگران اور منتظم ہیں۔ طلبہ کے لیے وظیفہ کی ضرورت تھی تو اس زمین کو دسترخوان بنایا تاکہ طلبا وظیفہ پاسکیں اور ان کی ضروریات پوری ہوں اور وہ ہمہ تن علم کی تکمیل میں لگ کر استحقاقِ خلافت کو مکمل کریں اور اس طرح انسان کی فوقیت باقی تینوں ذی شعور انواع پر واضح ہوگئی، جس کی بنا علم ہے۔

مجدّدین عُلمائے ربّانی انبیا کے نائب ہیں: یہ علمی اور عملی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔

انبیا علیہم السلام اوّلین خلفائے ربّانی ہیں۔ ان کے بعد ان کے وارث خلیفہ ہوتے ہیں جو عُلمائے ربّانی ہیں اور اُن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے:

یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِّيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ، وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ.

اس علمِ دین کو تمام پچھلے لوگوں میں سے عادل افراد اختیار کریں گے اور اس سے غلو کرنے والوں کی تحریفات اور باطل پسندوں کی کج روی اور جہلا کی تاویلات کا دفاع کرتے رہیں گے۔

پھر ہر صدی پر مجدّدِ دین کا وعدہ دیا گیا ہے جو عُلمائے راسخین فی العلم ہوں گے۔ یہ حضرات عُلما اس علمِ الٰہی کو غلو کرنے والوں کی تحریفوں، باطل پسندوں کی دروغ بافیوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جو شکوک وشبہات اہلِ باطل اور اہلِ زیغ اس علم میں ڈالیں گے، یہ اہلِ علم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ پس یہ اُمت لاوارثی اُمت نہیں کہ جس کا جی چاہے اس کے علم ودین کا حُلیہ بگاڑ دے اور کسی بھی مفسد وعیّار کی دین میں پیش نہ چلے گی۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَيْفَ تَهْلِكُ أُمَّةٌ أَوَّلُهَا اَنَا، وَالْمَهْدِيُّ وَسْطُهَا، وَالْمَسِيْحُ آخِرُهَا.

کیسے ہلاک ہوسکتی ہے وہ قوم کہ جس کا اوّل میں ہوں، درمیان میں مہدی اور مسیح اخیر ہیں۔

دین کی حفاظت کا سامان: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى الضَّلَالَةِ.

میری اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي مَنْصُوْرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ، لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ، حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ.

میری اُمت کی ایک جماعت کی ہمیشہ دین پر مدد کی جاتی رہے گی۔ اُن کو ذلیل کرنے والا، اُن کی مخالفت کرنے والا، اُن کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ ہی کا حکم آجائے۔

پس جس اُمت کو اس قدر کے اخلافِ رشید کے وعدے دیے گئے ہوں وہ اُمت

لاوارث اُمت نہیں ہوسکتی۔ اس کی پشت پناہی اللہ ورسول کی طرف سے برابر جاری رہے گی۔ جیسا کہ رہتی آرہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

مَثَلُ أُمَّتِي كَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا يُدْرٰى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ. میری اُمت کی مثال بارش جیسی ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ اس کا اوّل زیادہ بہتر ہے یا اس کا اخیر۔

پس انبیا علیہم السلام کا ترکہ اس وارث اُمتی کو ملتا رہے گا جو اپنا روحانی نسب حضور ﷺ سے جوڑے رکھے گا اور وہ ترکہ بھی علم ہے۔ کیوں کہ انبیا مال و دولت وراثت میں نہیں چھوڑتے، بلکہ علم ومعرفت چھوڑتے ہیں۔ اسی علم ومعرفت سے آدمی، آدمی بنتا ہے اور انسانیت اسی علم پر موقوف ہے۔ اگر دنیا میں انبیا علیہم السلام تشریف نہ لاتے تو انسان ڈھوروں، ڈنگروں کا ایک گلّہ ہوتا جو بہ قول ملائکہ اس دنیا میں آنے کے بعد بجز سفا کی اور مفسدہ پردازی کے کوئی دوسرا کام نہ جانتا۔ پس مادّی تعلیم اور سائنس وغیرہ عمدہ عمدہ سامان تو پیدا کرسکتی ہے مگر عمدہ انسان پیدا نہیں کرسکتی۔

مادّہ وسائنس کی بے مائیگی: عمدہ انسان صرف انبیا کی لائی ہوئی تعلیم ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ سائنس سے باہر تو چاندنا ہوتا ہے مگر اندر اندھیرا ہوجاتا ہے، نہ تقویٰ ظاہر ہوتا ہے نہ تقویٰ باطن۔ ظاہراً مادّیات کی ترقی ہورہی ہے مگر اندر کے جوہر تباہ ہورہے ہیں۔ انسان نے نئی ایجادات میں اپنی تمام طاقتوں کو گم کردیا اور اس کی محتاجگی بڑھ گئی۔ اگر وہ اُڑنا چاہے تو لوہے، لکڑی، پیتل کا محتاج ہے۔ اگر بعید مسافت پر خبر دینا چاہے تو لاسلکی اور وائرلیس کا محتاج۔ اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا چاہے تو ریل، موٹر کا محتاج۔ یعنی خود اپنے نفس کی اندرونی طاقت سے یہ کام نہیں کرسکتا، بلکہ ان آلات و وسائل کا دست نگر ہے۔ مرد وہ تھے جنھوں نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ ہزارہا میل کی مسافت پر بلا لاسلکی کے آواز پہنچائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بیت اللہ کے بن جانے کے بعد حج کرنے کی ہدایت کی آواز لگائی تو وہ سارے عالم میں گونجی۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مسجدِ نبوی سے ساریہ رضی اللہ عنہ کو آواز دی تو وہ

ڈھائی سو میل پر بلا ریڈیو کے پہنچی۔ انھوں نے بلند پروازی دکھلائی۔ وہ کسی ہوائی جہاز کے محتاج نہ ہوئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر پہنچے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ساتوں آسمانوں سے گزر کر مستویٰ تک پہنچے۔ مگر محض اپنی اندرونی روحانی قوت سے، نہ کہ مادّی وسائل سے۔ اس لیے اپنے اندر جوہر پیدا کرو۔ لوہے، پیتل کے محتاج بن کر مت رہ جاؤ۔ اسباب کے بندے نہ بنو۔ مسبّب الاسباب کے بندے بنو۔ آج کی یہ ترقی انتہائی محتاجگی کی ترقی ہے۔ حالاں کہ انسانی ترقی استغنا کی ترقی ہے۔ لوہے، پیتل اور دیگر معدنیات کا غلام بن جانا ترقی نہیں بلکہ ان چیزوں کو اپنی غلامی پر مجبور کر دینا ترقی ہے۔ آج کا انسان صرف اُس جگہ باکمال ہے جہاں مشینیں ہوں، بجلی ہو، پاور ہاؤس ہو، پٹرول ہو۔ جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہ عاجز، بے بس اور بے کس ہے۔ انسانِ کامل وہ ہے کہ اگر زمین پر ہو تو بھی باکمال ہو، اگر زمین کے اندر ہو تو بھی باکمال۔

علمِ الٰہی کی مثال: شیخ شہاب الدین سہروردی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس کو مولائے رومی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ رومیوں نے کہا: ہم اچھے صنّاع اور کاریگر ہیں۔ چینیوں نے کہا: ہم ہیں۔ بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ تم اپنی اپنی صنّاعی دکھلاؤ۔ اس وقت دونوں صنّاعیوں کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ کی گئی کہ بادشاہ نے ایک مکان بنوایا اور اس کے درمیان پردے کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ چینیوں سے کہا کہ نصف مکان میں تم اپنی کاریگری دکھلاؤ اور رومیوں سے کہا کہ دوسرے نصف میں تم اپنی صنّاعی کا نمونہ پیش کرو۔ چینیوں نے تو دیواروں پر پلاستر کر کے قسم قسم کے بیل بُوٹے اور پھول پتے رنگ بہ رنگ کے بنائے اور اپنے حصّے کے کمرے کو مختلف نقش و نگار اور رنگا رنگ بیل بُوٹوں سے گل و گل زار بنا دیا۔ اُدھر رومیوں نے دیواروں پر پلاستر کر کے ایک بھی پھول نہ بنایا اور نہ ہی کوئی ایک بھی رنگ لگایا، بلکہ دیوار کے پلاستر کو صیقل کرنا شروع کر دیا اور گھونٹتے گھونٹتے اتنا صاف اور چمک دار کر دیا کہ اس میں سے آئینہ کی طرح صورت نظر آنے لگی۔ جب دونوں نے اپنی اپنی کاریگری اور صنّاعی ختم کر لی تو

بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ آیا اور حکم دیا کہ درمیان سے دیوار نکال دی جائے۔ جوں ہی دیوار بیچ سے ہٹی، چینیوں کی وہ تمام نقاشی اور گل کاری رومیوں کی دیوار پر نظر آنے لگی اور تمام بیل بُوٹے رومیوں کی دیوار میں منعکس ہوگئے جسے رومیوں نے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا۔ بادشاہ سخت حیران ہوا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے، کیوں کہ ایک ہی قسم کے نقش و نگار دونوں طرف نظر آرہے تھے۔ آخر کار اُس نے رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ ان کی صنّاعی اعلیٰ ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی صنّاعی بھی دکھلائی اور ساتھ ہی چینیوں کی کاریگری بھی چھین لی۔

مولانا روم نے اس قصّے کو نقل کر کے آخر میں بطور نصیحت کے فرمایا کہ اے عزیز! تو اپنے دل پر رومیوں کی صنّاعی جاری کر، یعنی اپنے قلب کو ریاضت و مجاہدہ سے مانجھ کر اتنا صاف کر لے کہ تجھے گھر بیٹھے ہی دنیا کے سارے نقش و نگار اپنے دل میں نظر آنے لگیں ؎

ستم است اگر ہوست کشد بہ سیر سروِ چمن درآ
تو زغنچہ کم دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

یعنی تو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھول دے اور اس میں سے ہر قسم کا مادّی میل کچیل نکال کر پھینک اور اسے علمِ الٰہی کی روشنی سے منوّر کر دے تو تجھے دنیا و آخرت کے حقائق و معارف گھر بیٹھے ہی نظر آنے لگیں گے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید اوستا

ایسے قلبِ صافی پر بے اُستاد و کتاب براہِ راست علومِ خداوندی کا فیضان ہوتا ہے اور وہ روشن سے روشن تر ہوتا جاتا ہے۔ مگر یہ شان مادّی علوم کی نہیں، صرف روحانی اور شرعی علوم کی ہے۔ جب کہ ان پر عمل کیا جائے۔ حدیث میں ہے: مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ. عمل کی برکت سے حق تعالیٰ قلب میں وہ علوم ڈالتا ہے جو پہلے سے اس میں نہ تھے۔ اس لیے انسان اگر انسانیت چاہتا ہے تو اوّلاً عالم بنے، پھر عامل بنے۔ تب آخر کار علمِ لدنّی کا وارث بنتا ہے۔ پس ابتدائی علم علمِ دراست ہے اور انتہائی علم علمِ وارثت ہے۔ یہ کتابوں کے درس و مطالعے کا علم علمِ درایت ہے۔

مدارسِ دینیہ انسانیت کی فیکٹریاں ہیں: اوراس کی عملی مشق سے پیداشدہ بصیرت و گہرائی علمِ وراثت ہے، مگر علمِ وراثت نصیب ہوتا ہے علمِ دراست ہی سے۔ پس مدارس علمِ دراست سکھاتے ہیں اور علمِ وراثت کا راستہ صاف کرتے ہیں۔ اگر یہ مدارسِ دینیہ نہ ہوں تو نہ علمِ دراست ملے نہ علمِ وراثت۔ پس یہ مدارس اس لیے قائم کیے جارہے ہیں کہ جو علوم ہمیں انبیا سے وراثت میں ملے ہیں ان کو انسانوں تک پہنچا کر انسانوں کو انسان بنایا جائے۔ اس لیے یہ مدارس گویا سچّے انسانوں کو ڈھالنے کی فیکٹریاں ہیں۔ پس سائنس کی فیکٹریاں اور مشینریاں سامان ڈھالتی ہیں اور یہ مدارس کی فیکٹریاں انسان ڈھالتی ہیں۔ جس کے ظاہر و باطن علوم انبیا سے روشن ہیں۔ مادّی علوم محض ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمایش سکھاتے ہیں اور یہ حقیقی علوم (علومِ شرعیہ) باطن کی آراستگی سکھاتے ہیں۔ مادّی علوم صورت کا جمال بخشتا ہے اور روحانی علم سیرت کا جمال عطا کرتا ہے اور محض صورت کا جمال ایک عارضی حسن و جمال ہے، جو جاتا آتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن مٹ جائے گا۔ اسے تو دو دن بخار ہی آکر مٹا دیتا ہے۔ یہ تمام رعنائی اور زیبائی ختم ہوجاتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بڑھاپے سے یہ ظاہری جمال کے سارے نقش و نگار زائل ہوجاتے ہیں اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں، وہ تو ساری صورتیں اور خوب صورتیاں مٹا کر رہتی ہے۔ البتہ سیرت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ سیرت دنیا میں جیسی بھی بنالی جائے اُسے موت نہیں مٹا سکتی۔ وہ قبر میں، حشر میں اور اس کے بعد برابر قائم رہتی ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ، وَتَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيُوْنَ. اُٹھائے جاؤ گے تم جس حال میں تم مرو گے اور مرو گے تم جس حال میں تم زندہ رہو گے۔

حشر تمہارا اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی اور موت اس حالت پر آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے۔ آج کل نوجوان صورت کے بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ حالاں کہ اس چیز کے بنانے سے کیا فائدہ جو بنی ہے بگڑنے کے لیے۔ یعنی محض صورت آرائی شہوت رانی ہے اور سیرت آرائی مردانگی ہے۔ پس آپ اس صورت کو کہاں تک بنائیں گے جو بگڑنے ہی کے لیے بنی ہے؟ اس کو کہاں تک بنائیں گے سنواریں گے۔ بنانا اس چیز کا

ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاقِ فاضلہ اور علوم و کمالات ہیں۔ دنیا میں صورت فتنے کا ذریعہ بنتی ہے اور سیرت عز و جاہ کا۔ یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں ڈالے گئے۔ مصر کے بازار میں کھوٹے داموں بیچے گئے۔ زلیخا کے غلام بنے۔ پھر جیل خانے میں قید ہوئے۔ یہ سارے فتنے حسنِ صورت نے پیدا کیے، لیکن جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا تو وہاں سیرت نے کام کیا۔ چناں چہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی حکومت کا مطالبہ کرتے وقت یہ نہیں کہا کہ "اجعلني على خزائن الأرض إني حسين جميل" بلکہ "إني حفيظ عليم" کہا تھا۔ یعنی علمی اور عملی سیرت پیش کی تھی، جس سے حکومت ملی۔ صورت پیش نہیں کی تھی جس سے غلامی اور جیل کی قید و بند ملی تھی۔ پس حسنِ صورت فتنہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ سیرت عزّ و جاہ پیدا کرتا ہے۔ انبیا علیہم السلام اسی سیرت کے سنوارنے کے لیے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ صورتوں کی آرایش کرانے کے لیے نہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ.	حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمالوں کو دیکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا۔ اس کی نظر تمہارے دلوں اور اعمال پر ہے۔ وہاں یہ معیار نہیں کہ جو دولت مند اور خوب صورت ہو اُسے قبول فرمالے اور جو غریب بدصورت ہو اُسے ردّ کر دے۔ یہی معیار انبیا علیہم السلام کے ہاں بھی ہے کہ وہ آدمی کا ردّ و قبول حسنِ صورت سے نہیں بلکہ حسنِ سیرت سے کرتے ہیں۔ دنیا والوں کے ہاں ردّ و قبول کا معیار حسنِ صورت اور دولت ہے۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ صورتاً سیاہ تھے، غلام حبشی تھے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو هُوَ سَيِّدُنَا وَمَوْلَانَا فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی گردنیں بلال رضی اللہ عنہ کے آگے جھک جاتیں۔ حسنِ صورت کی وجہ سے نہیں کہ وہ تھا ہی نہیں، بلکہ حسنِ سیرت کی وجہ سے کہ وہ بہ حدِّ کمال ان میں موجود تھی۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مَا رَأَيْتُ أَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ ابْنِ أَبِيْ رَبَاحٍ.

حالاں کہ وہ صورت کے کالے تھے۔ وہ صورت کی تعریف نہیں تھی، سیرت کی تھی۔ جس نے کالوں کو گوروں کے اُوپر حاکم بنایا اور سیرت دو ہی چیزوں سے بنتی ہے: قوّتِ علم اور قوّتِ اخلاق (یعنی قوّتِ عمل) ان ہی دونوں قوّتوں سے آدمی باقی مخلوق پر فائق ہوتا ہے اور اسے خلافت ملتی ہے۔ قربِ حق نصیب ہوتا ہے اور صورت دو چیزوں سے بنتی ہے: دولت سے اور جہالت سے۔

مدارسِ دینیہ سیرت سنوارنے کے لیے ہیں: پس یہ مدارسِ دینیہ انسانیت کے ان ہی دو جوہروں کے پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ اگر یہ مدارس نہ ہوں تو انسانیت دنیا سے ختم ہوجائے گی۔ کالج اور یونیورسٹیوں میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں مگر وہاں انسانیت نہیں سکھائی جاتی۔ صرف صورتِ انسانی بنائی جاتی ہے۔ لیکن ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں جن کا نام مدرسہ اور خانقاہ ہے، حقیقتِ انسانیت سکھائی جاتی ہے اور انبیا علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلنے حتیٰ کہ فقر و فاقہ تک سے بھی انسانیت حاصل کرلینی سکھائی جاتی ہے۔ زہد و قناعت اسی علم کی بہ دولت قائم ہے۔ یہ عُلما سو پچاس روپے کی تنخواہ پر بہ خوشی گزارہ کرلیتے ہیں، ورنہ آج کل سو روپے کیا وُقعت رکھتے ہیں۔ یہ اسی سیرت کی خوبی کا کمال ہے کہ یہ لوگ اس تھوڑے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس شعر کو بار بار پڑھتے اور کیف لے لے کر پڑھا کرتے تھے کہ

ماہیچ نداریم غم ہیچ نداریم   دستار نداریم غم پیچ نداریم

اور کبھی فرماتے:

لنگلے زیرو لنگلے بالا!   نے غم و زود نے غم کالا

اور کبھی فرماتے:

کس نیاید بہ خانہ درویش   کہ خراج زمین و باغ بدہ

کل تک ہم زہد و قناعت کی فضیلت محض شرعی تعلیم پیش کر کے بتلاتے تھے، لیکن آج زمانے نے اس کی خوبیوں کا خود دنیا والوں کو مشاہدہ کرادیا ہے۔ ہزاروں من غلّے والے

غیر مطمئن ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپے والے پریشان حال اور نالاں ہیں۔ لیکن جن کے پاس غلّہ ہی نہیں یا بہ قدرِ ضروری ہے وہ مطمئن ہیں۔ پس دنیا کی کثرت اور سرمایہ داری کی اِفراط حسن نہیں۔ ایمان اور تقویٰ حسن ہے۔ ورنہ دنیا کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ جب آتی ہے جب بھی مصیبت لے کر آتی ہے اور جب جاتی ہے جب بھی مصیبت چھوڑ کر جاتی ہے۔ بہر حال اس کے بٹورنے کی مساعی کی جگہ اگر آپ اپنی سیرت کو بنانے کی فکر کریں تو دنیا ہاتھ سے نہ جائے گی اور آخرت بھی درست ہو جائے گی۔

خاتمہ: حاصل یہ ہے کہ انسان کو علم ہی کی وجہ سے افضلیت اور نیابت ملی اور وہ کائنات کی ساری ذی شعور مخلوقات پر بازی لے گیا۔ اس لیے اس فضیلت کو اپنے حق میں باقی کر لیجیے اور جو منصب حق تعالیٰ نے بلا قیمت عطا فرما دیا ہے اس کے تحفّظ کی سعی کیجیے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ علم بھی حاصل کریں اور عمل سے بھی آراستہ ہوں۔ آمین۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة إنك أنت الوهاب.

محمد طیّب

مدیر دارالعلوم دیوبند

۲۲/اکتوبر ۱۹۵۸

مطبوعات مکتبۃ البشریٰ

قرآنی مطبوعات

قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (۲۵) مجلد
قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (جی ۲۵) مجلد
قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (۲۳) مجلد
قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (جی ۲۳) مجلد
قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (۱۹) مجلد
قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (جی ۱۹) مجلد
قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (۱۵) کارڈ کور
قرآن مجید حافظی پندرہ سطری (۱۳) کارڈ کور
الم پارہ (درمیانہ) کارڈ کور
دس سورہ (مع اردو ترجمہ) (سورۂ فاتحہ تا فیل)
سورۂ یٰس (درمیانہ، بڑا)
تفسیر عثمانی (۲ جلد)
قصص القرآن (اوّل تا چہارم) (۲ جلد)

قرآن مجید حافظی سولہ سطری (۲۳) مجلد
قرآن مجید حافظی سولہ سطری (جی ۲۳) مجلد
قرآن مجید حافظی تیرہ سطری (۱۹) مجلد
قرآن مجید حافظی تیرہ سطری (جی ۱۹) مجلد
قرآن مجید (بیاضی برائے ترجمہ) مجلد
دس پارہ (۱ تا ۱۰، ۱۱ تا ۲۰، ۲۱ تا ۳۰) مجلد
پنج پارہ (درمیانہ، بڑا) مجلد
سہ پارہ (درمیانہ، بڑا) مجلد
عم پارہ درسی: الفاتحہ تا النبا (درمیانہ، بڑا)
عم پارہ (درمیانہ، بڑا) کارڈ کور
پنج سورہ (الکہف، السجدۃ، یٰس، الواقعۃ، الملک)
تفسیر بیان القرآن (۳ جلد)

قاعدے

نورانی قاعدہ (درمیانہ، بڑا)
نورانی قاعدہ (۲ تختیاں کارڈ لیمی نیشن)
اقرأ قاعدہ (درمیانہ، بڑا)
اقرأ قاعدہ (۲ تختیاں کارڈ لیمی نیشن)
بغدادی قاعدہ (درمیانہ)
قاعدہ یسرنا القرآن (درمیانہ)

نورانی قاعدہ (رنگین تجویدی)
نورانی قاعدہ (لیمی نیشن)
قاعدہ جمعیت (لیمی نیشن، درمیانہ، بڑا)
قاعدہ جمعیت (۲ تختیاں کارڈ لیمی نیشن)
قرآنی قاعدہ (درمیانہ)
رحمانی قاعدہ (درمیانہ)

اوراد و وظائف

الحزب الاعظم (ماہانہ مکمل) مجلد/جیبی
الحزب الاعظم (ہفتہ وار مکمل) مجلد/جیبی
منزل (جیبی، درمیانہ، بڑا)
اشرف العملیات
آسان نیکیاں (جیبی، درمیانہ)

مناجات مقبول (جیبی، درمیانہ)
مسنون دعائیں (جیبی، درمیانہ)
حصن حصین (جیبی، بڑا)
حزب البحر مع قصیدہ بردہ (مترجم)
زاد السعید (درمیانہ، بڑا)

دائمی نقشہ اوقات نماز و سحر و افطار

(برائے سندھ، پنجاب، خیبر پختون خوا) (کارڈ کیلنڈر)

چارٹ

عملی طریقہ نماز مردانہ (تصویری)
قواعد مخارج و تجوید (تصویری)

عملی طریقہ نماز مستورات (تصویری)
چالیس مسنون دعائیں

www.maktaba-tul-bushra.com.pk
al-bushra@cyber.net.pk

مطبوعات مکتبۃ البشریٰ

اردو و فارسی مطبوعات درس نظامی

- خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی
- معین الفلسفہ
- معین الاصول
- فوائد مکیہ ☆
- آسان منطق
- علم الصرف (اولین، آخرین)
- عربی صفوۃ المصادر
- جمال القرآن ☆
- نحو میر
- میزان ومنشعب
- آسان نحو (اول، دوم)
- تعلیم الاسلام ☆
- عربی زبان کا آسان قاعدہ
- نام حق
- پند نامہ ☆
- عربی کا معلم (اول تا چہارم)
- کلید جدید (مفتاح عربی کا معلم) (اول تا چہارم)
- آداب المعاشرت ☆
- تعلیم الدین ☆
- لسان القرآن (اول، دوم، سوم)
- تسہیل القواعد
- خیر الاصول ☆
- آسان اصول فقہ
- تیسیر المنطق
- فصول اکبری
- تاریخ اسلام
- علم النحو
- جوامع الکلم ☆
- صرف میر
- تیسیر الابواب
- آسان صرف (اول، دوم، سوم)
- بہشتی گوہر
- تسہیل المبتدی
- فارسی زبان کا آسان قاعدہ
- کریما ☆
- تیسیر المبتدی
- بہشتی زیور (تین حصے)
- حیات المسلمین
- تعلیم العقائد ☆
- سیر صحابیات
- مفتاح لسان القرآن (اول، دوم، سوم)

دیگر اردو مطبوعات

- آسان نماز ☆
- نماز مدلل ☆
- نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے ☆
- مسنون نماز کی چالیس حدیثیں ☆
- حدیث رسول ﷺ کا قرآنی معیار
- جامع الاخلاق
- سیرت سید الکونین وخلفائے راشدین رضی اللہ عنہم
- رسول اللہ ﷺ کے مکتوبات شریفہ
- معلم الحجاج
- مسائل ومعلومات حج وعمرہ
- نماز حنفی
- آئینہ نماز ☆
- اپنی نمازیں درست کیجیے
- رسول اکرم ﷺ کا طریقۂ نماز
- ابن ماجہ اور علم حدیث
- النبی الخاتم ﷺ
- رسول اللہ ﷺ کی نصیحتیں ☆
- علیکم بسنتی ☆
- کتاب الحج ☆
- حج وعمرہ قدم بہ قدم
- فضائل حج
- فضائل مسواک
- فضائل اعمال (اردو) (پشتو)
- فضائل نماز
- فضائل رمضان
- فضائل تجارت ☆
- فضائل علم
- بارہ مہینوں کے فضائل واحکام
- منتخب احادیث
- حیاۃ الصحابہ (۳ جلدیں) (اردو)
- خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم
- امت مسلمہ کی مائیں رضی اللہ عنہن
- سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا
- وصیت اور میراث کے احکام ☆
- حقوق العلم ☆
- آداب معیشت ☆
- پردہ کے شرعی احکام
- الحجامہ (جدید مع اضافہ مفیدہ) ☆
- مختصر الحجامہ
- مجموعہ وصایا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ
- علامات قیامت ☆
- خطبات الاحکام ☆
- اسلامی سیاست مع تکملہ
- اعجاز القرآن ☆
- زندگی سے بیزاری کیوں؟ ☆
- موت کی یاد ☆
- سال بھر کے مسنون اعمال
- اخبار الزلزلہ
- کامیابی
- اصلاح الرسوم
- دنیا وآخرت
- ڈاڑھی کا وجوب
- اصلاح انقلاب امت
- فضائل تہجد
- فضائل صدقات
- فضائل قرآن
- فضائل ذکر
- فضائل درود شریف
- فضائل استغفار ☆
- فضائل امت محمدیہ ﷺ ☆
- جزاء الاعمال ☆
- کرامات صحابہ رضی اللہ عنہم
- سوانح ابی ذر غفاری رضی اللہ عنہ
- نیک بیبیاں
- بہشتی زیور (مکمل)
- حقوق الوالدین ☆
- اصلاح النساء
- اصلاح خواتین
- شرعی پردہ
- اکرام مسلم
- اکرام المسلمین/حقوق العباد کی فکر کیجیے
- مرحبا بطالب العلم
- تبلیغ دین (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)
- الانتباہات المفیدۃ
- حیلے اور بہانے
- روضۃ الادب
- جواہر الحدیث
- ایک مسلمان کس طرح زندگی گزارے؟ ☆
- مرنے کے بعد کیا ہوگا؟
- شوق وطن
- صفائی معاملات
- اجتہاد اور تقلید
- عالم برزخ
- قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
- آداب المتعلمین
- دلیل الخیرات فی ترک المنکرات

www.maktaba-tul-bushra.com.pk
al-bushra@cyber.net.pk

جس کتاب کے ساتھ ☆ کی علامت ہے اس کا جیبی سائز بھی دستیاب ہے۔


رسول اکرم کا طریقہ نماز
حیاۃ المسلمین
القرآن الکریم
النبی الخاتم
علیکم بسنتی
حزب البحر
سیرت عائشہ
جواہر الحدیث
عالم برزخ
تعلیم العقائد
تحفۃ النکاح
تبلیغ دین